جلد ۹۲ جنوری ۱۹۸۰ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جنوری ۱۹۸۰ء مطابق صفر ۱۴۰۰ھ	جلد ۹۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ۴۱۱۰۱۶ ــــ ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ بیس روپے۔ فی پرچہ ۲/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذری ہوئی تاریخ کے کچھ اوراق سامنے رکھ کر، یا جغرافیائی طور پر دور پار کے کچھ ممالک کے حالات جان کر یہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ روسی جارحیت اور سوشلزم کے خونخوارانہ انقلاب کا عمل کس طرح ہوتا ہے۔ مگر آج ہم پڑوسی برادر ملک میں یہ سب کچھ ہوتا ہوا اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے اپنے گھر کی چھت سے ساتھ کے آنگن میں مار دھاڑ دیکھی جا رہی ہو۔

برطانیہ جب تک برصغیر میں رہا اُس نے اپنی ڈپلومیسی سے افغانستان کو ایک محفوظ حاجب سٹیٹ کی طرح قائم رکھا۔ بلکہ برصغیر سے چلے جانے کے بعد بھی اس کی سیاستِ خارجہ کی آنکھ افغانستان پر رہی۔ اور وہ ایسی تدبیریں اختیار کرتا رہا کہ روس افغانستان کو ایک آزاد و خودمختار ملک کی حیثیت سے علی حالہا رہنے دے۔ مگر جنگی، سفارتی اور تجارتی مہارتوں سے قائم شدہ یہ توازن ٹوٹ گیا۔

روس نے افغانستان سے دوستی کے تعلقات بڑھائے، اُسے کچھ امداد دی جاتی رہی۔ امداد کے ساتھ روسی ماہرین بھی آئے جن میں کمیونزم کے نقیب بھی تھے اور وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں پر اثر انداز ہوتے رہے، اور کچھ جاسوس بھی ہو سکتے ہیں جو افغانستان کی حکومت، اس کے نظم و نسق اور اس کی فوج اور عوام کے بارے میں کریملن کو ضروری معلومات بہم پہنچاتے رہے ہوں۔

روس کو جب کوئی کارروائی کرنی ہوتی ہے تو وہ بالعموم دوستی کے راستے ہی کی جاتی ہے۔ اسی دوستی کے ماحول میں وہ انقلاب اُٹھوا کر ظاہر شاہ کو رخصت کیا گیا اور سردار داؤد آ گئے۔ سردار داؤد کو روس نے مرغِ دست آموز بنانے کی کوشش کی، مگر جادو نہیں چلا۔ نتیجہ یہ کہ سردار داؤد اور

اس کا خاندان ایک دن اچانک اپنے خون کے سیلاب میں بہہ گئے - ترہ کی آئے، وہ بھی مطمئن نہ کر سکے، ان کا بھی خاتمہ ہو گیا - پھر حفیظ اللہ امین آئے - وہ بھی کارآمد نہیں نکلے - لہٰذا انقلاب نے انہیں بھی موت کے حوالے کر کے کرسیٔ اقتدار پر ببرک کارمل کو لا بٹھایا -

بیس ماہ میں تین خونریز محلاتی انقلاب!

اور دوسری طرف وزیروں، سرکاری افسروں، ملازموں، اُستادوں اور وکلا اور ائمہ اور خطیبوں اور قبائلی سرداروں کی صفیں مسلسل گولیوں کا نشانہ بنائی جاتی رہیں - ادھر عوام کی بھاری اکثریت بے سروسامانی کے باوجود اوّل روز ہی سے اشتراکی لادینیت کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی - اس نے بڑے شہروں کے آس پاس کے علاقوں کے علاوہ سرزمین افغانستان کا بڑا حصہ قبضے میں لے لیا، سرکاری اسلحہ چھین چھین کر فوج سے لڑتے رہے - پھر فوج کی ٹولیاں بھی اُن سے جا کر ملنے لگیں - ادھر چار لاکھ سے زیادہ مہاجرین ایمان اور آزادی اور آبرو کو بچانے کے لیے پاکستان میں پناہ گزیں ہیں - حکومت کے پاس اب فوج کا نصف حصہ رہ گیا ہے - یہ صورت اگر چند سے اور رہتی تو کسی بیرونی امداد کے بغیر بھی غیور پٹھان اشتراکی اقلیت کے تسلط کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتے -

اس نازک مرحلے پر کمیونسٹ اقلیت کے تسلط اور اُس کے وجود کو افغانستان میں بچانے اور مستحکم کرنے کے لیے روسی فوجیں ٹوٹ پڑیں - دس بیس ہزار نہیں، تقریباً ایک لاکھ سپاہ بکتر بند گاڑیوں، راکٹوں، میزائیلوں، نیپام بموں، جدید ترین ہوائی جہازوں اور ہیلی کوپٹروں کے ساتھ افغانستان میں پھیل گئی ہے، جیسے گھاس کی ہر پتی اور پتھر کے ہر سنگ ریزے سے لڑائی لڑنی ہے - افغانستان جیسے ملک میں ایسی بھاری فوجی قوت کا داخلہ یہ بتاتا ہے کہ کامل غارت گری مطلوب ہے — افغان عوام کی بھی، اور اسلام کی بھی!

کہا جاتا ہے کہ یہ جارحیت نہیں ہے، ہم لوگ تو افغانستان کی دعوت پر غیر ملکی مداخلت کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے آئے ہیں؟

اچھا تو آپ کو بلانے والا کون تھا؟ کہتے ہیں کہ کوئی ٹیلیفونی پیغام حفیظ اللہ امین کی طرف سے دیا گیا تھا - یہ اگر درست ہے تو آپ نے خود حفیظ اللہ امین کو کیا تحفظ دیا جس کی دعوت پر امداد کرنے

آئے تھے؟ کیا حفیظ اللہ امین کا خاتمہ اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ خود ایک غیر ملکی مداخلت کا شکار ہوا۔ اور وہ مداخلت روسی ہی تھی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دعوت انقلابی کونسل نے دی تھی۔ انقلابی کونسل کی ماہیت ذرا بیان فرمایئے اس میں مختلف صوبوں اور دیہاتی عوام کی نمائندگی کہاں تک تھی۔ اسے کیا قوم نے خود تشکیل دیا تھا؟ کیا اس میں تمام نقطہ ہائے نظر کے لوگ شامل تھے؟ کیا وہ شہریوں کی اکثریت کا اعتماد رکھتی تھی یا وہ اشتراکی اقلیت کی قائم کردہ اور اشتراکی اقلیت کا اقتدار ملک پر مسلط کرنے کے لیے تشکیل پائی تھی؟ اگر ایسا تھا تو کیا کسی بھی مہذب حکومت کا یہ کام ہے کہ وہ کسی جبری اور خون ریز طریقوں سے اقتدار پر قبضہ کرنے والی اقلیت کو اس غرض کے لیے مدد دے کہ وہ اکثریت کو اپنا شکار بنا سکے؟ باری باری جبری طور پر حکمرانی کرنے والے پرچمی اور خلقی کمیونسٹوں کی مجموعی تعداد کیا ان مہاجرین کے بھی برابر ہے جو ملک سے باہر آچکے ہیں جب یہ نہیں تو مدد کو آنے والی قوت کا کام تھا کہ وہ اکثریت کی حمایت میں کھڑی ہوتی اور اس پر جبر کرنے والی اقلیت کو ملیامیٹ کر دیتی ورنہ دنیا کے ہر ملک میں کوئی نہ کوئی اقلیت باہر سے فوجی مدد طلب کر سکتی ہے۔

یہ جو بار بار غیر ملکی مداخلت کا نام لیا جاتا ہے، یہ بالکل خیالی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ حفیظ اللہ امین کے دور تک، اور اس کے بعد بھی تاحال نہ تو امریکی یا چینی یا پاکستانی یا ایرانی مداخلت کاروں کو —— دو چار سو کی تعداد میں نہ سہی —— دس یا پانچ کی تعداد میں بھی عالمی پریس کے سامنے نہیں لایا جا سکا۔ کوئی غیر ملکی یا غیر روسی اسلحہ پیش نہیں کیا گیا۔ آخر یہ کیسی بیرونی مداخلت ہے؟ اگر بیرونی مداخلت سے مراد یہ ہے کہ چھاپہ مار عوام میں سے کچھ لوگ سرحدوں سے باہر جنگ کی تربیت پا کر آتے ہیں تو اول تو تربیتی اڈوں کی نشاندہی ہونی چاہیے تھی —— خصوصاً پاکستان میں ایسے اڈوں کا وجود ثابت کرنا ضروری تھا، کیونکہ پاکستان کے خلاف یہ الزام بار بار بیان کیا گیا ہے۔ اور اگر سرحدوں سے باہر سے اس نوعیت کی مداخلت ہو بھی رہی تھی کہ سو پچاس افراد کچھ تربیت لے آتے رہے ہوں تو اس معمولی سی صورتِ حالات سے یہ کیسے جائز ہوتا ہے کہ ایک لاکھ روسی فوج مع جدید ترین مہلک سازوسامان کے افغانستان میں داخل کر دی جائے۔ آخر کسی ملک کے نہتے اور غیر تربیت یافتہ عوام اقلیتی جبریت کے خلاف کیسے لڑیں؟

اور بھارت کی طرف سے تو بیانات بدل بدل کر جو بیان دیے گئے ان میں روسی جارحیت کی حمایت یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ چھاپہ ماروں کو تربیت دے کر دوسروں نے اس کا جواز پیدا کیا ہے۔

اگر ہم یہ قصہ بھول بھلا بھی دیں کہ ۱۹۷۱ء میں اندرا گاندھی حکومت کے تحت حق الاعلان چھاپہ ماروں کو تربیت دے کر سابق مشرقی پاکستان میں منظم طریق سے بھیجا جاتا رہا تھا، اور اس بیرونی مداخلت کی سزا بھی بیرونی مداخلت کرنے والوں کو نہیں، بلکہ بیرونی مداخلت کرنے والوں نے اصل باشندوں اور اُن کی فوج کو دی تھی۔ اندرا گاندھی اپنے زورِ تدبر کے ساتھ یہ بتائیں کہ اگر لاکھوں بے سروسامان چھاپہ ماروں میں سے ایک ہزار نے بھی تربیت پائی ہو تو ان کو تہس نہس کرنے کے لیے اوّل تو افغانستان کی اپنی فوج کم نہ تھی، اور اگر روسی فوج کی مدد درکار بھی تھی تو آخر ایک لاکھ کا لشکرِ جرار کس لیے؟

قدرتی طور پر جب کوئی فوجی جارحیت بہانے ڈھونڈ کر کی جاتی ہے۔ اور فوج کی تعداد اور اسلحہ کی مقدار محض کسی ملک کے اندرونی قضیوں کو درست کرنے سے زیادہ ہوتی ہے تو یہی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اصل مقصد کچھ اور ہے۔

اصل مقصد پہلے سے مختلف صورتوں میں بیان ہو چکا ہے۔ روس کو ایک تو ایران، عرب اور افریقی ممالک کے تیل کے خزانوں پر قبضہ کرنا ہے۔ دوسرے اسے گرم سمندروں پر اقتدار چاہیے۔

یہ مقصد جہاں عربوں کے لیے واضح خطرہ سامنے لاتا ہے، وہاں پہلے درجے میں ایران اور پاکستان ایسے دو ملک سامنے آتے ہیں جو جغرافیائی سیاست کی حالیہ تبدیلی کے نتیجے میں دوسرا نشانہ بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں روس نواز اشتراکی عناصر پچھلے عرصے میں کہتے پھر رہے ہیں کہ ہم افغانستان جیسا انقلاب پاکستان میں بھی لانا چاہتے ہیں، بلکہ بعض نے تو انفرادی طور پر مذاق مذاق میں اختلاف کرنے والے دوستوں سے کہہ دیا ہے کہ عنقریب ہم تمہیں پھانسیوں اور گولیوں کا لقمہ بنائیں گے۔

لیکن پاکستان ہو یا ایران، دونوں ملکوں میں اسلامی انقلاب کے بڑے شعوری اور ایمانی جذبات اس حد تک ردِ عمل آ چکے ہیں کہ دنیا کی کسی بھی بڑی طاقت کی جارحیت کے آگے مسلمان قومیں ناک رگڑنے پر تیار نہیں ہوں گی اگر افغانستان کے باشندے ایمان و غیرت کے بل پر شدید بے سروسامانی اور بے شمار جانی نقصانات کے باوجود مہینوں لڑ سکتے ہیں —— اور جہاں وہ بالکل نہتے ہوں وہاں کلہاڑیوں اور لاٹھیوں اور چاقوؤں کا استعمال کر کے اپنی بیزاری کا اظہار کر سکتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان اور ایران کے مسلم باشندے اپنے ایمان و غیرت سے کام لے کر معرکہ آرا نہ ہوں۔ جو قوم سروں اور لاشوں کے پہاڑ کھڑے کرنے اور اپنے لہو کے

دریا بہا دینے پر تیار ہو جائے اس پر حملہ کرنے والے ان پہاڑوں اور دریاؤں کو پار نہیں کر سکتے۔

ضرورت پڑنے پر پاکستان کو اصلاً اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ ہماری فوج دنیا کی بہت اچھی فوج ہے۔ وہ اسلحہ اور سامان سے بھی بالکل تہی دامن نہیں۔ ہتھیاروں کی کمی بیشی کے باوجود لڑائی لڑی جا سکتی ہے ہماری اصل قوت ہمارا مقدس عقیدہ، نظریہ اور ہمارا ایمان، نظم اور ہمارا جذبہ جہاد ہے۔ ایک بار حالات اس جذبے کو بیدار کر دیں تو پھر قلت سامان کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے ہم سامان بھی فراہم کر لیں گے اور بے سرو سامانی میں بھی کٹ مریں گے۔

غنیمت ہے کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ روسی جارحیت کی زد میں آنے والی قوتیں بہت سی ہیں۔ عالم اسلام کو خطرے کا احساس ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ مغربی ممالک بھی چونک اٹھے ہیں چین بھی پہلے ہی سے چوکنا ہے وقت کے اس نئے چیلنج کا کامیابی سے سامنا کرنے کے لئے چند امور بے حد ضروری ہیں۔

۱۔ مخالف اسلام نظریات، خصوصاً مادہ پرستانہ اشتراکی تصورات کو اس کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے کہ وہ ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ میں زہر پھیلا سکیں۔ ہماری صفوں کو پھاڑ سکیں، ہمارے علیحدگی پسندوں کو بھڑکائیں اور ہمارے نشری اور اشاعتی اداروں کو ہمارے خلاف استعمال کریں۔

۲۔ جہاد کے لیے جس مکمل اتحاد کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے سخت ضرر رساں وہ تفرقہ بازی ہے جو مسلمانوں کو آپس میں ہمیشہ پھاڑتی رہتی ہے، نمازیں الگ کراتی ہے، رشتے ختم کراتی ہے، تکفیری مہمات چلاتی ہے، حتیٰ کہ مسجدوں کو باقاعدہ حملے کر کر کے ان کو فتح کرتی رہتی ہے۔

مختلف گروہوں کے علماء کو جمع ہو کر اختلاف کی حدود طے کرنی چاہئیں اور پیروکاروں سے ان کی پابندی کرانے کا پروگرام بنانا چاہیے کہ اسلامی اخوت کو نقصان نہ پہنچے، اور قومی اتحاد روبعمل آسکے۔ کہنے کو ہر کوئی اتحاد کے راگ الاپتا ہے مگر ہر مسلک کے اپنے شرائط محبت و اعتماد کو پورا نہیں کیا جاتا۔

۳۔ علاقائیت کی بنیاد پر علیحدگی پسندوں کے قلم و دہن سے اب تفرقہ کی کوئی بات نہیں نکلنی چاہیے۔

۴۔ رشوت، خیانت، تشدد، اور مختلف جرائم ایک عرصے سے زور پکڑ رہے ہیں۔ قانون اپنی جگہ ان کے خلاف پہلے سے زیادہ مضبوط کارروائی کرے، لیکن دوسری طرف ملک و قوم کی بقا اور دین و ایمان کے تحفظ کے لیے دردمندانہ اپیلیں کرتے ہوئے لوگوں سے درخواست کی جائے کہ وہ ان ہلاکت آفریں خرابیوں

سے کنارہ کش ہو جائیں۔

۵۔ خوش حال طبقوں کو تلقین کی جائے کہ وہ زندگی کو مسرفانہ مظاہروں سے خالی کریں، تاکہ ان کی تقلید کر کے متوسط اور غریب شہری تباہ نہ ہوں۔ دولت پرستی کا چسکہ ختم کیا جائے۔ آرائشوں اور آسائشوں کی روک تھام کی جائے، اور قانونی طور پر زمین اور مکان سے لے کر گاڑیوں اور لباس تک، ہر دائرے میں "تحدیدات" نافذ کر دی جائیں۔ اس تحدی عمل میں قیادت پیش رو بنے اور نمونہ دے۔

۶۔ عمومی حیثیت میں ذرائع ابلاغ اور اخبارات اور سرکاری تقاریب کے ذریعے دیندارانہ زندگی اختیار کرنے پر لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ربیع الاوّل کے مہینے میں لوگ حضورؐ کی محبت کا کم سے کم یہ مظاہرہ ضرور کریں کہ وہ نماز اختیار کر لیں۔

یہ تبدیلیاں جہاد کے لیے صحیح جذبات کو فروغ دینے کا باعث ہوں گی۔

ادھر امریکہ کے صدر کارٹر افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف بڑے زور سے متحرک ہوئے ہیں اور ساری دنیا کی رائے عام کو انہوں نے متحرک کر دیا ہے۔ امریکہ اور مغربی ممالک کے بڑے وسیع مفاد خطرے میں پڑ رہے ہیں اور روسی جارحیت کی ذرا سی مزید پیش قدمی انہیں مستقل طور پر عالمی اثر و رسوخ کے لحاظ سے پسپا کر دے گی۔

مگر امریکہ کی کچھ کمزوریاں بھی ہیں:-

۱۔ امریکہ (اور دوسرے مغربی ممالک) کے مدبرین اتنے کوتاہ نظر تھے کہ آج جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا اندازہ دس برس پہلے نہیں کر سکے، حالانکہ اوسط سمجھ بوجھ کا آدمی بھی روس کی آئندہ ضروریات اور اس کے عزائم اور اقدامات کا نقشہ تیار کر سکتا ہے۔ افغانستان جب تباہ ہو گیا تو ہوش آئی۔ دس سال نہ سہی، اگر دو سال پہلے بھی امریکی قیادت یہ اندازہ کر سکتی تو وہ ایران اور پاکستان اور ترکی کے ساتھ اپنے تعلقات خراب کرنے سے ہر قیمت پر احتراز کرتی۔ انہی تعلقات کی خرابی نے روس کو بہترین موقع فراہم کیا ہے۔

۲۔ روس کی دوسری زیادتیاں ــــ خواہ وہ ارٹریا اور صومالیہ کے مسلمانوں کے خلاف حکومتوں کی فوجی مدد کی صورت میں ہوں یا جنوبی یمن میں اشتراکی اڈا بنانے کی صورت میں ــــ امریکہ کو ذرا بھی احساس نہیں دلا سکیں۔ بات جب آخری مرحلے پر آ پہنچی تو اب وہ چونکا ہے۔

۳۔ امریکہ کے آسائش پرست لوگ اپنی سرحدوں سے باہر جنگ ویت نام کے بعد کوئی لڑائی لڑنے کے

قابل نہیں ہیں اور نہ وہ افغانستان کو روسی جارحیت سے بچانے کے لیے روس کی طرح بطور خود کوئی کارروائی کر سکتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی لڑائی دوسروں سے لڑوائیں۔ خود امریکہ کے اندر بھی وہ مشینوں کے ذریعے لڑائی لڑ سکتے ہیں۔ جن کے بٹن دبانے سے زیادہ انہیں کچھ نہ کرنا پڑے۔ میرے نزدیک مستقبل میں امریکہ بین الاقوامی دائرے میں براہ راست کوئی مؤثر فوجی اقدام کبھی نہیں کر سکتا۔ روسی سپر پاور کے مقابلے میں امریکی سپر پاور کی یہ بھاری کمزوری ہے۔

اگر یہ کمزوری نہ ہوتی تو ویت نام میں ذلت آمیز پسپائی کے جو دھبے امریکہ کے دامن پر لگے تھے۔ انہیں وہ افغانستان میں بہ آرام دھو سکتا تھا۔ کیونکہ ویت نامی عوام کے بخلاف افغانستان کے عوام کی بھاری اکثریت اس کے ساتھ ہوتی۔

۴۔ امریکہ کسی حال میں نہ خفیہ فیصلے کر سکتا ہے، نہ فوری اقدام۔ صدر، سینیٹ، کانگریس، پریس، رائے عام سب کو ہم آہنگ کرتے کرتے اتنا وقت گذر جاتا ہے کہ کوئی بات ہو بھی تو بعد از وقت ہوتی ہے۔ "جیسے کو تیسا" کے اصول پر کچھ نہیں ہو سکتا۔ میرے یہاں کوئی ایسی صورت قابل تصور نہیں ہے کہ جس طرح اچانک روس کی فوج افغانستان میں داخل ہو گئی تھی۔ امریکہ بھی اچانک کوئی فوری حرکت کر کے روس اور تمام دنیا کو چکر میں ڈال دیتا۔

مزید خرابی یہ ہے کہ صدارتی انتخابات سر پر ہیں اور صدر کارٹر کو ہر بات تول کر کہنی ہوتی ہے کہ کیا فیصلہ کس حد تک ووٹروں کو پسند ہو گا۔ دنیا میں کچھ ہو جائے اس وقت تو امریکی ووٹروں کا لحاظ ہر چیز سے برتر ہے۔ روس کو ایسا کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔

۵۔ امریکہ کے خلاف زیر گفتگو خطے میں —— یعنی عالم اسلام، افریقی ممالک اور جنوب مغربی ایشیا (برصغیر) میں عام رائے اچھی نہیں ہے، بلکہ ہر ملک یہ محسوس کرتا ہے کہ امریکہ سے تعلق رکھنا اس کے لئے باعث رسوائی ہو گا۔ خاص طور پہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان بے اعتمادی کی فضا عرصے سے موجود ہے۔

۶۔ متذکرہ وجوہ سے امریکہ کوئی مؤثر کارروائی کرنے کے لئے دوسری قوتوں کے ساتھ ایک طرح کا متحدہ محاذ بنانے پر مجبور رہے۔ اس پہلو سے بلاشبہ اس کی کامیابی حیران کن ہے کہ مجموعی طور پہ عالمی رائے عام کو اس نے تیزی سے روس کے خلاف متحرک کر دیا ہے، نیز مغربی ممالک، اسلامی ممالک اور جاپان، آسٹریلیا اور چین وغیرہ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ (باقی بر صفحہ ۴۴)

تذکرۂ انبیاء

عَلَیہِمُ السَّلَام

از

مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب اوّل ـــــــ قصۂ آدم

(قسط ۲)

فصل ۱۴

تخلیقِ انسانی کے متعلق مزید تصریحاتِ قرآنی

<u>انسان قابلِ ذکر نہ تھا</u>

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا ○ (الدھر۔ آیت ۱)	کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔

پہلا فقرہ ہے هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ۔ اکثر مفسرین و مترجمین نے یہاں هَلْ کو قَدْ کے معنی میں لیا ہے، اور وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ بے شک یا بلاشبہ انسان پر ایسا ایک وقت آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ هَلْ عربی زبان میں "کیا" کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے، اور اس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی تو ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں اور کسی سے پوچھتے ہیں "کیا یہ واقعہ پیش آیا ہے؟" کبھی ہمارا مقصود سوال کرنا نہیں ہوتا بلکہ کسی بات کا انکار کرنا ہوتا ہے اور یہ انکار اس انداز میں کرتے ہیں کہ "کیا یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟" کبھی ہم ایک شخص سے کسی بات کا اقرار کرانا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے اس سے پوچھتے ہیں "کیا میں نے تمھاری رقم ادا کر دی؟" اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرانا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ مخاطب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبور کر دیں جو لازماً اس کے اقرار سے بطورِ نتیجہ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں "کیا میں نے تمھارے ساتھ کوئی برائی کی ہے؟" اس سے مقصود صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ آپ نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے اس کے ساتھ میں برائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔

آیت زیر بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اسی آخری معنی میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقع اس پر ایک وقت ایسا گزرا ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر سی حالت سے کر کے اُسے پورا انسان بنا کھڑا کیا۔ وہ آخر اسے دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز ہوگا؟

دوسرا فقرہ ہے حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ۔ دھر سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے اور نہ انتہا، اور حین سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ اس لامتناہی زمانے کے اندر ایک طویل مدت تو ایسی گزری ہے جب سرے سے نوعِ انسانی ہی موجود نہ تھی۔ پھر اس میں ایک وقت ایسا آیا جب انسان نام کی ایک نوع کا آغاز کیا گیا۔ اور اس زمانے کے اندر ہر شخص پر ایک ایسا وقت آیا ہے جب اسے عدم سے وجود میں لانے کی ابتدا کی گئی۔

تیسرا فقرہ ہے لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا، یعنی اس وقت وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ اس کا ایک حصہ باپ کے نطفے میں ایک خوردبینی کیڑے کی شکل میں اور دوسرا حصہ ماں کے نطفے میں ایک خوردبینی بیضے کی شکل میں موجود تھا۔ مدتہائے دراز تک تو انسان یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دراصل وہ اس کیڑے اور بیضے کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ اب طاقتور خوردبینوں سے ان دونوں کو دیکھ تو لیا گیا ہے لیکن اب بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنا انسان باپ کے اس کیڑے میں اور کتنا ماں کے اس بیضے میں موجود ہوتا ہے۔ پھر استقرارِ حمل کے وقت ان دونوں کے ملنے سے جو ابتدائی خَلِیَّہ (CELL) وجود میں آتا ہے وہ ایک ایسا ذرہ بے مقدار ہوتا ہے کہ بہت طاقتور خوردبین سے نظر آسکتا ہے اور اسے دیکھ کر بھی بادی النظر میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی انسان بن رہا ہے کہ اس حقیر سی ابتدا سے نشو و نما پاکر کوئی انسان اگر بنے گا بھی تو وہ کس قد و قامت، کس شکل و صورت، کس قابلیت اور شخصیت کا انسان ہوگا۔ یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ اس وقت وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا اگرچہ انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے وجود کا آغاز ہو گیا تھا۔

مادۂ تخلیق

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ — ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے

مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر۔ آیت ۲۶) سے بنایا۔

یہاں قرآن اس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا بشریت کے حدود میں نہیں آیا ہے، جیسا کہ نئے دور کی ڈارونیت سے متاثر مفسرین قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ اس کی تخلیق کی ابتداء براہ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ	اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو
ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۔	مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکا یک تم بشر ہو کر (زمین
(الروم۔ آیت ۲۰)	میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔

انسان کا مایۂ تخلیق اس کے سوا کیا ہے کہ چند بے جان مادے ہیں جو زمین میں پائے جاتے ہیں مثلاً کچھ کاربن، کچھ کیلشیم، کچھ سوڈیم اور ایسے ہی چند اور عناصر۔ انہی کو ترکیب دے کر وہ حیرت انگیز ہستی بنا کر کھڑی کی گئی ہے جس کا نام انسان ہے اور اس کے اندر احساسات، جذبات، شعور، تعقّل اور تخیل کی وہ عجیب قوتیں پیدا کر دی گئی ہیں جن میں سے کسی کا منبع بھی اس کے عناصر ترکیبی میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہی نہیں کہ ایک انسان اتفاقاً ایسا بن کر کھڑا ہوا ہو، بلکہ اس کے اندر وہ عجیب تولیدی قوت بھی پیدا کر دی گئی جس کی بدولت کروڑوں اور اربوں انسان وہی ساخت اور وہی صلاحیتیں لیے ہوئے بے شمار موروثی اور بے حد و حساب انفرادی خصوصیات کے حامل نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ کیا تمھاری عقل یہ گواہی دیتی ہے کہ یہ انتہائی حکیمانہ خلقت کسی صانع حکیم کی تخلیق کے بغیر آپ سے آپ ہو گئی ہے؟ کیا تم بحالت ہوش و حواس یہ کہہ سکتے ہو کہ تخلیق انسان جیسا عظیم الشان منصوبہ بنانا اور اس کو عمل میں لانا اور زمین و آسمان کی بے حد و حساب قوتوں کو انسانی زندگی

ل حماء عربی زبان میں ایسی سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر خمیر پیدا ہو چکی ہو، بالفاظ دیگر خمیر اٹھ آیا ہو۔ مسنون کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں متغیر، مُنتن اور اَملس یعنی ایسی سڑی ہوئی مٹی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو گئی ہو، دوسرے معنی ہیں مصوّر اور مصبوب، یعنی قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت دے دی گئی ہو۔ صلصال اس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔

کے لیے ساز گار کر دینا بہت سے خداؤں کی فکر و تدبیر کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا تمہارا دماغ اپنی صحیح حالت میں ہوتا ہے جب تم یہ گمان کرتے ہو کہ جو خدا انسان کو خالص عدم سے وجود میں لایا ہے وہ اسی انسان کو موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ	کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ
مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۝	سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا
وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ط	ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے
(یٰس۔ آیات ۷۷-۷۸)	اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔

یعنی وہ نطفہ جس میں محض ایک ابتدائی جرثومۂ حیات کے سوا کچھ نہ تھا، اس کو ترقی دے کر ہم نے اس حد تک پہنچایا کہ وہ نہ صرف جانوروں کی طرح چلنے پھرنے اور کھانے پینے لگا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس میں شعور و تعقل اور بحث و استدلال اور تقریر و خطابت کی وہ قابلیتیں پیدا ہو گئیں جو کسی حیوان کو نصیب نہیں ہیں حتیٰ کہ اب وہ اپنے خالق کے بھی منہ آنے لگا ہے۔ یعنی ہمیں مخلوقات کی طرح عاجز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس طرح انسان کسی مردے کو زندہ نہیں کر سکتا، اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔

یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہم نے بے جان مادہ سے وہ ابتدائی جرثومۂ حیات پیدا کیا جو اس کا ذریعۂ تخلیق بنا اور پھر اس جرثومے کی پرورش کر کے اسے یہاں تک بڑھا لائے کہ آج وہ ہمارے سامنے باتیں چھانٹنے کے قابل ہوا ہے۔

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ	انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے ہوئے
(الرحمٰن۔ آیت ۱۴)	گارے سے بنایا۔

تخلیقِ انسانی کے ابتدائی مراتب جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں ان کی سلسلہ وار ترتیب مختلف مقامات کی تصریحات کو جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے: (۱) تُراب، یعنی مٹی یا خاک۔ (۲) طین، یعنی گارا جو مٹی میں پانی ملا کر بنایا جاتا ہے۔ (۳) طِینٍ لازب، لیس دار گارا، یعنی وہ گارا جس کے اندر کافی دیر تک پڑے رہنے کے باعث لیس پیدا ہو جائے۔ (۴) حَمَاٍ مَّسْنُون، وہ گارا جس کے اندر بُو پیدا ہو جائے (۵) صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُونٍ كَالْفَخَّارِ، یعنی وہ سڑا ہوا گارا جو سوکھنے کے بعد پکی ہوئی مٹی کے ٹھیکرے جیسا ہو جائے۔ (۶) بَشَر جو مٹی کی اس آخری صورت سے بنایا گیا، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص روح پھونکی، جس کو فرشتوں سے

سجدہ کرایا گیا، اور جس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا گیا۔ (۷) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ پھر آگے اس کی نسل ایک حقیر پانی جیسے سَت سے چلائی گئی جس کے لیے دوسرے مقامات پر نطفہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

ان مدارج کے لیے قرآن مجید کی حسب ذیل آیات کو ترتیب وار ملاحظہ کیجیے: كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (آل عمران - ۵۹) بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (السجدہ - ۷) اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (الصّٰفّٰت - ۱۱) چوتھا اور پانچواں مرتبہ آیت زیر تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ اور اس کے بعد کے مراتب ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں: اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (ص - ۷۱-۷۲) خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء - ۱) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (السجدہ - ۸) فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ (الحج - ۵)

مدارج تخلیق

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ الاٰية (الحج - آیت ۵)	لوگو، اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے۔

اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان اُن مادوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نوع انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا جو براہ راست مٹی سے بنائے گئے تھے، اور پھر آگے نسل انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا۔ جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (آیات ۷-۸) "انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ایک سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے"۔

یہ اشارہ ہے ان مختلف اطوار کی طرف جن سے ماں کے پیٹ میں بچہ گزرتا ہے۔ ان کی وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو آج کل صرف طاقت ور خوردبین ہی سے نظر آسکتی ہیں، بلکہ ان بڑے بڑے نمایاں تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اس زمانے کے عام بدو بھی واقف تھے۔ یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتداً

تب یہ بستہ خون کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے، پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے جس میں پہلے شکل صورت کچھ نہیں ہوتی اور آگے چل کر انسانی شکل نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسقاط کی مختلف حالتوں میں چونکہ تخلیقِ انسانی کے یہ سب مراحل لوگوں کے مشاہدے میں آتے تھے، اس لیے انھیں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے علم الجنین کی تفصیلی تحقیقات کی نہ اس وقت ضرورت تھی نہ آج ہے۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا (نوح - آیت ۱۴)	حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمھیں بنایا ہے

یعنی تخلیق کے مختلف مدارج اور اطوار سے گزارتا ہوا تمھیں موجودہ حالت پر لایا ہے۔ پہلے تم ماں اور باپ کی صلب میں الگ الگ نطفوں کی شکل میں تھے۔ پھر خدا کی قدرت ہی سے یہ دونوں نطفے ملے اور تمھارا استقرارِ حمل ہوا۔ پھر نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں بتدریج نشوونما دے کر تمھیں پوری انسانی شکل دی گئی اور تمھارے اندر وہ تمام قوتیں پیدا کی گئیں جو دنیا میں انسان کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تمھیں درکار تھیں۔ پھر ایک زندہ بچے کی صورت میں تم بطنِ مادر سے باہر آئے اور ہر آن تمھیں ایک حالت سے دوسری حالت تک ترقی دی جاتی رہی یہاں تک کہ تم جوانی اور کہولت کی عمر کو پہنچے۔ ان تمام منازل سے گزرتے ہوئے تم ہر وقت پوری طرح خدا کے بس میں تھے۔ وہ چاہتا تو تمھارا استقرارِ حمل ہی نہ ہونے دیتا اور تمھاری جگہ کسی اور شخص کا استقرار ہوتا۔ وہ چاہتا تو ماں کے پیٹ ہی میں تمھیں اندھا، بہرا، گونگا یا اپاہج بنا دیتا یا تمھاری عقل میں کوئی فتور رکھ دیتا۔ وہ چاہتا تو تم زندہ بچے کی صورت میں پیدا ہی نہ ہوتے۔ پیدا ہونے کے بعد بھی وہ تمھیں ہر وقت ہلاک کر سکتا تھا اور اس کے ایک اشارے پر کسی وقت بھی تم کسی حادثے کے شکار ہو سکتے تھے۔ جس خدا کے بس میں تم اس طرح بے بس ہو اس کے متعلق تم نے یہ کیسے سمجھ رکھا ہے کہ اس کی شان میں ہر گستاخی کی جا سکتی ہے، اس کے ساتھ ہر طرح کی نمک حرامی اور احسان فراموشی کی جا سکتی ہے، اس کے خلاف ہر قسم کی بغاوت کی جا سکتی ہے اور ان حرکتوں کا کوئی خمیازہ نہیں بھگتنا پڑے گا۔

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝	کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو رحمِ مادر
ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝	میں ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا،
فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ	پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا
الْأُنثَىٰ ۝ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ	درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو
أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۝	قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ

(القیمۃ۔ آیات ۳۷ تا ۴۰) مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ابتدائی نطفے سے تخلیق کا آغاز کر کے پورا انسان بنا دینے تک کا سارا فعل اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہے ان کے لیے تو فی الحقیقت اس دلیل کا جواب ہے ہی نہیں، کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی برتیں، ان کی عقل یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جو خدا اس طرح انسان کو دنیا میں پیدا کرتا ہے وہ دوبارہ بھی اسی انسان کو وجود میں لے آنے پر قادر ہے۔ رہے وہ لوگ جو اس صریح حکیمانہ فعل کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں وہ اگر ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے نہیں ہیں تو آخر ان کے پاس اس بات کی کیا توجیہہ ہے کہ آغازِ آفرینش سے آج تک مسلسل دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم میں کس طرح ایک ہی نوعیت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اس تناسب سے ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آئندہ اس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے؟ کیا یہ بھی اتفاقاً ہی ہوئے چلا جا رہا ہے؟ اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے لیے آدمی کو کم از کم اتنا بے شرم ہونا چاہیے کہ وہ اٹھ کر بے تکلف ایک روز یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ لندن اور نیویارک، ماسکو اور پیکنگ اتفاقاً آپ سے آپ بن گئے ہیں۔

روحِ انسانی کی حقیقت

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر۔ آیت ۲۹) جب میں اسے پورا کر چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں۔

انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں، جن کے مجموعہ ہی کا نام روح ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کالبدِ خاکی پر ڈالا گیا ہے، اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔

یوں تو ہر وہ صفت جو مخلوق میں پائی جاتی ہے، اس کا مصدر و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ فَاَمْسَكَ عِنْدَهٗ تِسْعَةً وَّتِسْعِیْنَ وَاَنْزَلَ فِی الْاَرْضِ جُزْءًا وَّاحِدًا فَمِنْ ذٰلِكَ الْجُزْءِ یَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰی تَرْفَعَ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَّلَدِهَا خَشْیَةَ اَنْ تُصِیْبَهٗ (بخاری و مسلم) "اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر ان

ہیں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ زمین پر اتارا۔ یہ اسی ایک حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا کھر اٹھاتا ہے تاکہ اسے ضرر نہ پہنچ جائے تو یہ بھی دراصل اسی حصۂ رحمت کا اثر ہے۔[۱]

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (السجدہ۔ آیت ۹)

پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔

روح سے مراد محض وہ زندگی نہیں ہے جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقاتِ ارضی سے ممتاز ایک صاحبِ شخصیت ہستی، صاحبِ اَنا ہستی، اور حاملِ خلافت ہستی بنتا ہے۔ اس روح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح یا تو اس معنی میں فرمایا ہے کہ وہ اسی کی ملک ہے اور اس کی ذاتِ پاک کی طرف اس کا انتساب اسی طرح کا ہے جس طرح ایک چیز اپنے مالک کی طرف منسوب ہوکر اس کی چیز کہلاتی ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر علم، فکر، شعور، ارادہ، فیصلہ، اختیار اور ایسے ہی دوسرے جو اوصاف پیدا ہوئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ ان کا سرچشمہ مادے کی کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے، اللہ کی حکمت سے اس کو دانائی ملی ہے، اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے۔ یہ اوصاف کسی بے علم، بے دانش اور بے اختیار ماخذ سے انسان کے اندر نہیں آئے ہیں۔

دو صنفوں کی متناسب تخلیق

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے

---

[۱] مگر جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفات کا پرتو اس پر ڈالا گیا ہے اس سے کوئی دوسری مخلوق سرفراز نہیں کی گئی۔

یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی غلطی بھی آدمی کر جائے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ پانا الوہیت کا کوئی جز پالینے کا ہم معنی ہے۔ حالانکہ الوہیت اس سے وراء الورا ہے کہ کوئی مخلوق اس کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پاسکے۔ (از مؤلف)

اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا۔ — تمھارے لیے تمھاری جنس سے بیویاں بنائیں

(الروم۔ آیت ۲۱) — تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔

خالق کا کمالِ حکمت یہ ہے کہ اس نے انسان کی صرف ایک صنف نہیں بنائی، بلکہ اسے دو صنفوں (SEXES) کی شکل میں پیدا کیا جو انسانیت میں یکساں ہیں، جن کی بناوٹ کا بنیادی فارمولا بھی یکساں ہے، مگر دونوں ایک دوسرے سے مختلف جسمانی ساخت، مختلف ذہنی و نفسی اوصاف اور مختلف جذبات و داعیات لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے درمیان یہ حیرت انگیز مناسبت رکھ دی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہے، ہر ایک کا جسم اور اس کے نفسیات و داعیات دوسرے کے جسمانی و نفسیاتی تقاضوں کا مکمل جواب ہیں۔ مزید براں وہ خالقِ حکیم ان دونوں صنفوں کے افراد کو آغازِ آفرینش سے برابر اس تناسب کے ساتھ پیدا کیے چلا جا رہا ہے کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دنیا کی کسی قوم یا کسی خطۂ زمین میں صرف لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوئے ہوں، یا کہیں کسی قوم میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہوں۔ یہ ایسی چیز ہے جس میں کسی انسانی تدبیر کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان ذرہ برابر بھی نہ اس معاملہ میں اثر انداز ہو سکتا ہے کہ لڑکیاں مسلسل ایسی زنانہ خصوصیات اور لڑکے مسلسل ایسی مردانہ خصوصیات لیے ہوئے پیدا ہوتے رہیں جو ایک دوسرے کا ٹھیک جوڑ ہوں، اور نہ اس معاملہ ہی میں اس کے پاس اثر انداز ہونے کا کوئی ذریعہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی پیدائش اس طرح مسلسل ایک تناسب کے ساتھ ہوتی چلی جائے۔ ہزارہا سال سے کروڑوں اور اربوں انسانوں کی پیدائش میں اس تدبیر و انتظام کا اتنے متناسب طریقے سے پیہم جاری رہنا اتفاقاً بھی نہیں ہو سکتا، اور یہ بہت سے خداؤں کی مشترک تدبیر کا نتیجہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز صریحاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ایک خالقِ حکیم، اور ایک ہی خالقِ حکیم نے اپنی غالب حکمت و قدرت سے ابتداءً مرد اور عورت کا ایک موزوں ترین ڈیزائن بنایا، پھر اس بات کا انتظام کیا کہ اس ڈیزائن کے مطابق بے حد و حساب مرد اور بے حد و حساب عورتیں اپنی الگ الگ انفرادی خصوصیات لیے ہوئے دنیا بھر میں ایک تناسب کے ساتھ پیدا ہوں۔

یہ انتظام الل ٹپ نہیں ہو گیا ہے بلکہ بنانے والے نے بالارادہ اس غرض کے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ مرد اپنی فطرت کے تقاضے عورت کے پاس، اور عورت اپنی فطرت کی مانگ مرد کے پاس پائے اور دونوں

ایک دوسرے سے وابستہ ہوکر ہی سکون و اطمینان حاصل کریں۔ یہی وہ حکیمانہ تدبیر ہے جسے خالق نے ایک طرف انسانی نسل کے برقرار رہنے کا، اور دوسری طرف انسانی تہذیب و تمدن کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر یہ دونوں صنفیں محض الگ الگ ڈیزائنوں کے ساتھ پیدا کر دی جاتیں اور ان میں وہ اضطراب نہ رکھ دیا جاتا جو ان کے باہمی اتصال و وابستگی کے بغیر مبدل بسکون نہیں ہو سکتا تو انسانی نسل تو ممکن ہے کہ بھیڑ بکریوں کی طرح چل جاتی، لیکن کسی تہذیب و تمدن کے وجود میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تمام انواعِ حیوانی کے برعکس نوعِ انسانی میں تہذیب و تمدن کے رونما ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ خالق نے اپنی حکمت سے مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لیے وہ مانگ، وہ پیاس، وہ اضطراب کی کیفیت رکھ دی جسے سکون میسر نہیں آتا جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جڑ کر نہ رہیں۔ یہی سکون کی طلب ہے جس نے انھیں مل کر گھر بنانے پر مجبور کیا۔ اسی کی بدولت خاندان اور قبیلے وجود میں آئے۔ اور اسی کی بدولت انسان کی زندگی میں تمدن کا نشوونما ہوا۔ اس نشوونما میں انسان کی ذہنی صلاحیتیں مددگار ضرور ہوئی ہیں مگر وہ اس کی اصل محرک نہیں ہیں۔ اصل محرک یہی اضطراب ہے جسے مرد و عورت کے وجود میں ودیعت کر کے انھیں "گھر" کی تاسیس پر مجبور کر دیا گیا۔ کون صاحبِ عقل یہ سوچ سکتا ہے کہ دانائی کا یہ شاہکار فطرت کی اندھی طاقتوں سے محض اتفاقاً سرزد ہو گیا ہے؟ یا بہت سے خدا یہ انتظام کر سکتے تھے کہ اس گہرے حکیمانہ مقصد کو ملحوظ رکھ کر ہزارہا برس سے مسلسل بے شمار مردوں اور بے شمار عورتوں کو یہ خاص اضطراب لیے ہوئے پیدا کرتے چلے جائیں؟ یہ تو ایک حکیم اور ایک ہی حکیم کی حکمت کا صریح نشان ہے جسے صرف عقل کے اندھے ہی دیکھنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ (۳۶)

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (الفرقان - آیت ۵۴)	اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس کے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔

یعنی بجائے خود یہی کرشمہ کیا کم تھا کہ وہ ایک حقیر پانی کی بوند سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق بنا کھڑی کرتا ہے مگر اس پر مزید کرشمہ یہ ہے کہ اس نے انسان کا بھی ایک نمونہ نہیں، بلکہ دو الگ نمونے (عورت اور مرد) بنائے جو انسانیت میں یکساں مگر جسمانی و نفسیاتی خصوصیات میں نہایت مختلف ہیں، اور اس اختلاف کی وجہ سے باہم مخالف و متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہیں۔ پھر ان جوڑوں

کو ملا کردہ عجیب توازن سے (جس میں کسی دوسرے کی تدبیر کا ادنیٰ دخل بھی نہیں ہے) دنیا میں مرد بھی پیدا کر رہا ہے اور عورتیں بھی، جن سے ایک سلسلۂ تعلقات بیٹوں اور پوتوں کا چلتا ہے جو دوسرے گھروں سے بہوئیں لاتے ہیں، اور ایک دوسرا سلسلۂ تعلقات بیٹیوں اور نواسیوں کا چلتا ہے جو دوسرے گھروں کی بہوئیں بن کر جاتی ہیں۔ اس طرح خاندان سے خاندان جڑ کر پورے پورے ملک ایک نسل اور ایک تمدن سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ	جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے
يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ	لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا
الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا	ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا
وَّاِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ	کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا
عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ○	ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر
(الشوریٰ ۔ آیت ۵۰)	قادر ہے۔

یہ اللہ کی بادشاہی کے مطلق (ABSOLUTE) ہونے کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے کوئی انسان، خواہ وہ بڑے سے بڑے دنیوی اقتدار کا مالک بنا پھرتا ہو، یا روحانی اقتدار کا مالک سمجھا جاتا ہو، کبھی اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ دوسروں کو دلوانا تو درکنار، خود اپنے ہاں اپنی خواہش کے مطابق اولاد پیدا کر سکے۔ جسے خدا نے بانجھ کر دیا وہ کسی دوا اور کسی علاج اور کسی تعویذ گنڈے سے اولاد والا نہ بن سکا، جسے خدا نے لڑکیاں ہی لڑکیاں دیں وہ ایک بیٹا بھی کسی تدبیر سے حاصل نہ کر سکا، اور جسے خدا نے لڑکے ہی لڑکے دیے وہ ایک بیٹی بھی کسی طرح نہ پا سکا۔ اس معاملہ میں ہر ایک قطعی بے بس رہا ہے، بلکہ بچے کی پیدائش سے پہلے کوئی یہ تک نہ معلوم کر سکا کہ رحمِ مادر میں لڑکا پرورش پا رہا ہے یا لڑکی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی خدا کی خدائی میں مختارِ کل ہونے کا زعم کرے، یا کسی دوسری ہستی کو اختیارات میں دخیل سمجھے تو یہ اس کی اپنی ہی بے بصیرتی ہے جس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ کسی کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت میں ذرّہ برابر بھی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ؕ مِنْ	کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے؟ نطفہ
نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۔	کی ایک بوند سے۔ اللہ نے اسے پیدا کیا، پھر

(عبس - آیات ۱۸ - ۱۹) اس کی تقدیر مقرر کی۔

یعنی پہلے تو ذرا یہ اپنی حقیقت پر غور کرے کہ کس چیز سے یہ وجود میں آیا؟ کس جگہ اس نے پرورش پائی؟ کس راستے سے یہ دنیا میں آیا؟ اور کس بے بسی کی حالت سے دنیا میں اس کی زندگی کی ابتدا ہوئی؟ اپنی اس اصل کو بھول کر یہ ہمچو ما دیگرے نیست کی غلط فہمی میں کیسے مبتلا ہو جاتا ہے اور کہاں سے اس کے دماغ میں یہ ہوا بھر جاتی ہے کہ اپنے خالق کے منہ آئے۔

یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں بن رہا تھا کہ اس کی تقدیر طے کر دی گئی۔ اس کی جنس کیا ہوگی؟ اس کا رنگ کیا ہوگا؟ اس کا قد کتنا ہوگا؟ اس کی جسامت کیسی اور کس قدر ہوگی؟ اس کے اعضا کس حد تک صحیح و سالم اور کس حد تک ناقص ہوں گے؟ اس کی شکل و صورت اور آواز کیسی ہوگی؟ اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی؟ اس کے ذہن کی صلاحیتیں کیا ہوں گی؟ کس سرزمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا؟ پرورش اور تربیت پائے گا اور کیا بن کر اٹھے گا؟ اس کی شخصیت کی تعمیر میں موروثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خودی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا؟ کیا کردار یہ دنیا کی زندگی میں ادا کرے گا، اور کتنا وقت اسے زمین پر کام کرنے کے لیے دیا جائے گا؟ اس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا۔ نہ اس میں ذرہ برابر ردّ و بدل کر سکتا ہے۔ پھر کیسی عجیب ہے اس کی یہ جرأت کہ جس خالق کی بنائی ہوئی تقدیر کے آگے یہ اتنا بے بس ہے اس کے مقابلہ میں کفر کرتا ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝	کیا ہم نے حقیر پانی سے تمھیں پیدا نہیں کیا اور
فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ اِلٰى قَدَرٍ	ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے
مَّعْلُوْمٍ ۝ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝	رکھا؟ تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت
(المرسلٰت - آیات ۲۰ تا ۲۳)	اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔

اصل الفاظ ہیں قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ (۲۱) کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ وہ مدت مقرر ہے، بلکہ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس کی مدت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ کسی بچے کے متعلق کسی ذریعہ سے بھی انسان کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کتنے مہینے، کتنے دن، کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ ماں کے پیٹ میں رہے گا اور اس کا ٹھیک وقتِ ولادت کیا ہوگا۔ اللہ ہی نے ہر بچے کے لیے ایک خاص مدت مقرر کی ہے اور وہی اس کو جانتا ہے۔

رحم مادر جب میں استقرار حمل ہوتے ہی بچے کو اتنی مضبوطی کے ساتھ جما دیا جاتا ہے اور نو مہینے تک اس کی حفاظت اور پرورش کے کیے جاتے ہیں کہ کسی شدید حادثے کے بغیر اسقاط نہیں ہو سکتا۔ [illegible] اسقاط کے لیے بھی غیر معمولی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں جو فن طب کی جدید ترقیات کے باوجود خطرے اور نقصان سے خالی نہیں ہے۔

قدرتِ الٰہی کے کرشمے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (المومنون۔ آیات ۱۲۔ ۱۳)	ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔

کوئی خالی الذہن آدمی بچے کو ماں کے رحم میں پرورش پاتے دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہاں وہ انسان تیار ہو رہا ہے جو باہر جا کر عقل و دانائی اور صنعت کے یہ کچھ کمالات دکھائے گا اور ایسی حیرت انگیز قوتیں اور صلاحیتیں اس سے ظاہر ہوں گی۔ وہاں وہ ہڈیوں اور گوشت پوست کا ایک پلندہ سا ہوتا ہے جس میں وضع حمل کے آغاز تک زندگی کی ابتدائی خصوصیات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نہ سماعت، نہ بصارت، نہ گویائی، نہ عقل و خرد، نہ اور کوئی خوبی۔ مگر باہر آ کر وہ چیز ہی کچھ اور بن جاتا ہے جس کو پیٹ والے جنین سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ اب وہ ایک سمیع و بصیر اور ناطق وجود ہوتا ہے۔ اب وہ تجربے اور مشاہدے سے علم حاصل کرتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک ایسی خودی ابھرنی شروع ہوتی ہے جو بیداری کے پہلے ہی لمحہ سے اپنی دسترس کی ہر چیز پر تحکم جتاتی اور اپنا زور منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر وہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے، اس کی ذات میں یہ "چیزے دیگر" ہونے کی کیفیت نمایاں تر اور افزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جوان ہوتا ہے تو بچپن کی بہ نسبت کچھ اور ہوتا ہے۔ ادھیڑ ہوتا ہے تو جوانی کے مقابلے میں کوئی اور چیز ثابت ہوتا ہے۔ بڑھاپے کو پہنچتا ہے تو نئی نسلوں کے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا بچپن کیا تھا اور جوانی کیسی تھی۔ اتنا بڑا تغیر کم از کم اس دنیا کی کسی دوسری مخلوق میں واقع نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ایک طرف کسی پختہ عمر کے انسان کی طاقتیں اور قابلیتیں اور کام دیکھے، اور دوسری طرف یہ تصور کرے کہ پچاس ساٹھ برس پہلے ایک روز جو بوند ٹپک کر رحم مادر میں گری تھی اس کے اندر یہ کچھ بھرا ہوا تھا، تو بے اختیار اس کی زبان سے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ہی نکلے گا۔

وجودِ انسان سے خالق اور اس کے حقوق پر استشہاد

يَآيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝

(الانفطار۔ آیات ۶ تا ۸)

اے انسان، کس چیز نے تجھے اپنے اس ربِ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا، جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا۔ تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا، تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔

یعنی کوئی معقول وجہ اس دھوکے میں پڑنے کی نہیں ہے۔ تیرا وجود خود بتا رہا ہے کہ تو خود نہیں بن گیا ہے، تیرے ماں باپ نے بھی تجھے نہیں بنایا ہے، عناصر کے آپ سے آپ جڑ جانے سے بھی اتفاقاً تو انسان بن کر پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم و توانا نے تجھے اس مکمل انسانی شکل میں ترکیب دیا ہے۔ تیرے سامنے ہر قسم کے جانور موجود ہیں جن کے مقابلے میں تیری بہترین ساخت اور تیری افضل و اشرف قوتیں صاف نمایاں ہیں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر تیرا سر بارِ احسان سے جھک جاتا اور اس ربِ کریم کے مقابلے میں تو کبھی نافرمانی کی جرأت نہ کرتا۔ تو یہ جانتا ہے کہ تیرا رب صرف رحیم و کریم ہی نہیں ہے، جبار و قہار بھی ہے۔ جب اس کی طرف سے کوئی زلزلہ یا طوفان یا سیلاب آ جاتا ہے تو تیری ساری تدبیریں اس کے مقابلہ میں ناکام ہو جاتی ہیں۔ تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا رب جاہل و نادان نہیں بلکہ حکیم و دانا ہے، اور حکمت و دانائی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جسے عقل دی جائے اس کے اعمال کا ذمہ دار بھی ٹھیرایا جائے، جسے اختیارات دیے جائیں اس سے حساب بھی لیا جائے کہ اس نے اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کیا، اور جسے اپنی ذمہ داری پر نیکی اور بدی کرنے کی طاقت دی جائے اسے نیکی پر جزا اور سزا بھی دی جائے۔ یہ سب حقیقتیں تیرے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں، اسی لیے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپنے ربِ کریم کی طرف سے جس دھوکے میں تو پڑ گیا ہے اس کی کوئی معقول وجہ موجود ہے۔ تو خود جب کسی کا افسر ہوتا ہے تو اپنے اس ماتحت کو کمینہ سمجھتا ہے جو تیری شرافت اور نرم دلی کو کمزوری سمجھ کر تیرے سر چڑھ جائے۔ اس لیے تیری اپنی فطرت یہ گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ مالک کا کرم ہرگز اس کا موجب نہ ہونا چاہیے کہ بندہ اس کے مقابلے میں جری ہو جائے اور اس غلط فہمی میں پڑ جائے کہ میں جو کچھ چاہوں کروں، میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

حضرت امام مالک رح

۹۳ھ تا ۱۷۹ھ

عبدالرشید عراقی۔ سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ

نام و نسب مالک نام، کنیت ابوعبداللہ، امام دارالہجرۃ لقب، والد کا نام انس تھا۔ آپ کے پردادا ابوعامر مشرف باسلام ہوئے اور یمن سے آکر مدینۃ النبی میں سکونت اختیار کی تھی۔ ابوعامر کی ملاقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ مگر امام صاحب کے دادا مالک بن ابوعامر جلیل القدر تابعی تھے۔ آپ کی ولادت ۹۳ھ مدینہ طیبہ میں ہوئی۔

مدینہ طیبہ جس وقت امام صاحب کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت مدینہ طیبہ علماء و فضلاء کا مخزن تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اگرچہ بہت سے صحابہ کرام رض مدینہ منورہ سے نکل کر دوسرے مقامات پر آباد ہو گئے تھے۔ مگر مدینہ طیبہ کی علمی پوزیشن میں کسی قسم کا فرق نہ آیا تھا۔ بدستور اسی طرح قائم رہی۔ حضرت علی رض کی خلافت کے ابتدائی زمانہ تک مدینہ اسلام کا بڑا مرکز تھا۔ مگر جب حضرت علی رض نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دارالحکومت بنایا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ بھی مدینہ کی طرح اسلام کا ایک علمی مرکز بن گیا۔ حضرت امام مالک رح نے جب ہوش سنبھالا تو مدینہ کی علمی پوزیشن پہلے کی طرح قائم تھی۔

امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:۔

"باید دانست کہ مدینہ مشرفہ در زمانِ او پیشتر از زمانِ متاخرہ بلاشبہ مرجع فضلاء و رجال

علماء بودہ است۔ [1]

یعنی جاننا چاہیے کہ مدینہ منورہ امام مالک رح کے زمانے میں بعد کے فرود سے پہلے بلا شبہ فضلاء کا مرجع اور اہلِ علم کی فرودگاہ تھا۔ البتہ امام مالک رح کے بعد وہاں علمی انحطاط آگیا تھا۔

اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں اور نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ منورہ امام مالک رح کے زمانے تک علم وفضل کا گہوارہ تھا۔ اور امام مالک رح مدینہ کے عمل کو مستقل حجت سمجھتے تھے۔ عمل اہلِ مدینہ پر حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں بڑی دلچسپ بحث کی ہے، جو قابلِ دید ہے۔

تحصیل علم | امام صاحب نے جب ہوش سنبھالا تو مدینہ باغ وبہار کا مرکز تھا۔ اُن کا گھر خود علم کا مرجع تھا۔ امام صاحب نے قرآن مجید کی سند و قرأت امام القراء نافع بن عبدالرحمٰن المتوفی ۱۶۹ھ مولیٰ حضرت ابن عمر رض سے حاصل کی۔ حضرت نافع کے علاوہ امام صاحب نے دیگر شیوخ سے تحصیلِ علم کی۔ امام مالک رح نے طلب علم کے لیے مدینہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔ کیونکہ مدینہ اُس وقت دار العلوم تھا۔ اور تمام ممالک اسلامیہ کے شیوخ و اساتذہ خود آستانۂ نبوی پہ حاضر ہوتے تھے۔

امام صاحب نے ان شیوخ واساتذہ سے استفادہ کیا جو صدق وطہارت میں معروف اور حفظ فقہ میں ممتاز تھے۔ امام صاحب نے جن شیوخ سے موطاء میں روایت کی ہے اُن کی تعداد ۹۵ ہے۔ یہ سب اساتذہ مدنی ہیں۔ اسی طرح مدینہ کا علم جو مختلف سینوں میں پراگندہ تھا۔ وہ اب ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا۔ اسی وجہ سے "امام دار الہجرۃ" آپ کا لقب ہوا۔

مجلسِ درس | مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رض کے بعد اُن کی علمی درسگاہ کے جانشین حضرت نافع تھے۔ امام مالک رح ۱۲ برس تک حضرت نافع رح کے درس میں شریک رہے۔ حضرت نافع رض کے انتقال کے بعد امام مالک اُن کے جانشین ہوئے۔

امام صاحب کی مجلس درس ہمیشہ پُرتکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی۔ جب حدیث نبوی ﷺ کے املاء کا وقت آتا تھا۔ پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک

---

[1] مصفیٰ شرح موطاء۔

زیب تن فرماتے۔ اس لیے کہ حضرت امام لباس کے معاملے میں بہت خوش ذوق تھے۔ یمن، مصر اور خراسان تک سے عمدہ عمدہ کپڑے منگواتے۔ عطر کا بہت شوق تھا۔ اس سے آپ کے ذہن کی پاکیزگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ درس سے پہلے نیا جوڑا پہن کر اور خوشبو وغیرہ لگا کر مجلس علمی کی صدارت کے لیے مسجد نبوی میں تشریف لاتے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مجلس درس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے

"جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکا ہوتا تھا۔ طلبا کا ہجوم، مستفتیوں کا اژدھام، امراء کا ورود، علماء کی تشریف آوری، سیاحوں کا گذر، حاضرین کی مؤدب نشست، در خانہ پر سواریوں کا انبوہ، دیکھنے والوں پر رعب و وقار طاری کر دیتا تھا۔[1]"

امام صاحب صاحبِ حکومت نہ تھے۔ لیکن صاحبِ حکومت اس آستانہ پر جھکتے تھے۔ پوری دنیائے اسلام امام صاحب کی شہرت سے معمور ہو گئی تھی۔ ایشیا، افریقہ، یورپ ہر سہ براعظم سے مسافرانِ علم کے کارواں بلا انقطاع مدینہ کا رُخ کرتے تھے۔ اور اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوشک ان یضرب الناس اکباد الابل فلا یجدون احدا اعلم من علم المدینۃ[2]

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلب علم کے لیے اونٹ ہنکائیں گے۔ لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ کسی کو نہ پائیں گے۔

سفیان بن عیینہؒ اور عبد الرزاق نے اس پیش گوئی کا مصداق حضرت امام مالک رحمہ اللہ کو قرار دیا۔

---

[1] حیات امام مالکؒ ص ۱۴۳ ۔ [2] ترمذی جلد ۲ ص ۹۳

حضرت امام مالکؒ صاحب جب درس حدیث کے لیے مجلس لگاتے تو اتنے ادب اور احترام کے ساتھ بیٹھتے کہ مجلس میں کسی قسم کی کوئی حرکت نہ ہو۔ جس سے سوئے ادب کا شائبہ ہو۔ سامعین بالکل خاموشی سے آپ کی بات سنتے۔ اور جیسا کہ مشہور واقعہ ہے۔ اور تقریباً ہر سوانح نگار نے جس نے امام صاحب کی سیرت وسوانح لکھی ہے، اس کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے کہ ایک دفعہ دوران درسِ حدیث ایک بچھو نے آپ کو کئی بار کاٹا۔ درد کی وجہ سے آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا جاتا تھا۔ مگر آپ نے اُس وقت تک پہلو نہ بدلا جب تک حدیث پاک ختم نہ کر لی۔

تلامذہ امام صاحب کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ اور امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے تلامذہ کا شمار نا ممکن ہے۔ اس لیے کہ جس نے ۶۲ سال تک فقہ، فتاویٰ اور درس وتدریس میں گزارے ہوں۔ اُن کے شاگردوں کا احصاء بہت مشکل ہے۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ شامل ہیں

فقہ مالکؒ حضرت امام مالکؒ کی فقہ کی بنیاد فقہاء صحابہ یعنی ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ اور فقہائے سبعہ یعنی کبار تابعین حضرات یعنی :

سعید بن المسیب	المتوفی ۹۳ھ
عروہ	المتوفی ۹۴ھ
ابو بکر بن عبد الرحمن بن الحارث بن ہشام المتوفی ۹۴ھ	
عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود	المتوفی ۹۸ھ
قاسم بن محمد بن ابی بکر	المتوفی ۱۰۶ھ
سلیمان بن یسار	المتوفی ۱۰۹ھ
خارجہ بن زید	المتوفی ۱۰۹ھ

اور صغار تابعین زہری اور اُن جیسے حضرات پر اعتماد پر مالک کے مذہب کی بنیاد ہے۔

اخلاق وعادات بہت خود دار تھے۔ حمام میں غسل کرنا اس وقت ایک عام معمول تھا۔ مگر امام صاحب نے کبھی حمام میں غسل نہیں کیا۔ فرماتے کہ حمام میں عام لوگوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے اور عامیانہ ذوق کی باتیں سننا پڑتی ہیں، اس لیے حمام میں نہانے سے احتراز کرتا ہے۔ اور دنیا

کرتے تھے۔

کہ میں کم علم وعقل اور جاہلوں کی صحبت سے ہمیشہ گریزاں رہا۔

اخلاقی انفرادیت کا اتنا اہتمام تھا کہ لوگوں کے سامنے کبھی کوئی کھانے پینے کی چیز استعمال نہ کرتے۔ یہ سب کچھ بتقاضائے وقار وتمکین تھا۔ ورنہ جن لوگوں سے سابقہ تھا۔ اُن کے حق میں نہایت درجہ شفیق تھے۔

توجہ الی اللہ کا یہ حال تھا کہ انگوٹھی کے نگینہ میں "حسبنا اللہ ونعم الوکیل" محض اس لیے کندہ کرا رکھا تھا کہ یہ مضمون ہر وقت مدنظر رہے۔ اسی طرح گھر کے دروازے پر "ماشاء اللہ" لکھوا رکھا تھا۔ اور فرماتے کہ یہ قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وَلَوْلَآ إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ۔

جب تم اپنے باغ میں داخل ہوتے تو تم نے اس کی بہار دیکھ کر یہ کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو منظور ہے۔[1]

مدینہ سے محبت | امام صاحب کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی۔ بجز سفر کے کبھی باہر نہیں نکلے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حد ادب واحترام کرتے تھے اور اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں کہ تمام زندگی مدینہ میں کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں نکلے کہ اس میں اُن کے خیال میں سوء ادب کا پہلو نکلتا تھا۔ فرماتے۔

"جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد مبارک دفن ہو۔ میں وہاں کیسے گھوڑے پر سوار ہو سکتا ہوں"۔

امام صاحب مدینہ میں جس مکان میں رہتے تھے۔ وہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا تھا۔ تمام زندگی اسی مکان میں گزار دی۔ آپ اس مکان کا کرایہ ادا کرتے رہے۔ اپنا ذاتی مکان نہیں بنایا۔ مسجد نبوی میں نشست اس جگہ کرتے تھے جہاں خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروق نشست کرتے تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف کے وقت بستر مبارک

---

[1] القرآن سورۃ الکہف آیت ۳۹۔

بچھایا جاتا تھا[1]

ابتلاء | آپ کو بھی ابتلاء و آزمائش میں گزرنا پڑا۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے:

ایک تو محمد ذوالنفس الزکیہ المتوفی ۱۴۵ھ نے مدینہ منورہ میں اور اُن کے بھائی ابراہیم نے بصرہ میں حکومت کی زیادتیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو امام صاحب نے اُن کا ساتھ دیا۔ جس پر والی مدینہ آپ کے خلاف ہوگیا۔ اور دوسرا واقعہ "جبری طلاق" کا مسئلہ تھا۔ امام صاحب کا فتویٰ تھا کہ "جبری طلاق" واقع نہیں ہوتی۔ اور ایسی طلاق کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لیے یہ طلاق نہیں ہوگی۔ والیٔ مدینہ نے اس مسئلہ کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔

چنانچہ امام صاحب بھی زیر عتاب آگئے۔ آپ کو گدھے پر سوار کر کے تمام مدینہ میں پھیرایا گیا۔ اور ۷۰ کوڑے آپ کی پیٹھ پر مارے گئے۔ تمام پیٹھ خون آلود ہوگئی۔ دونوں ہاتھ مونڈھوں سے اُتر گئے۔ مگر امام صاحب جھکے نہیں۔ جب آپ کو گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں پھرایا گیا۔ تو آپ فرماتے۔

"کہ جو مجھ کو جانتا ہے، وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں۔ فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں[2]۔

۱۶۴ھ میں جب خلیفہ منصور مدینہ منورہ آیا تو اس نے جعفر والی مدینہ سے امام صاحب سے جو سلوک اُس نے کیا تھا۔ قصاص لینا چاہا۔ مگر امام صاحب نے روک دیا اور فرمایا کہ جب کوڑا پڑتا تھا تو اُسی وقت میں جعفر کو قرابت رسولؐ کی وجہ سے معاف کر دیتا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے حضرت امام کی عالی ظرفی۔

تصنیفات | آپ کی تصنیفات کی تعداد گیارہ ہے جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی مایۂ ناز کتاب امام مالکؒ میں لکھا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں:

موطا[1]۔ رسالہ مالک[2] آبی الرشید۔ احکام القرآن[3]، المدونۃ[4] الکبریٰ۔ رسالہ مالک[5] ابی ابن مطرف۔

---

[1] مدارک از قاضی عیاض

[2] ماخوذ از حیات امام مالک از مولانا سید سلیمان ندویؒ

رسالہ مالک ابی بن وہب - کتاب المتنبہ - کتاب المناسک - تفسیر غریب القرآن - کتاب احکام السائل عن مالک - تفسیر القرآن۔[1]

اب یہاں صرف آپ کی مشہور کتاب "موطا" کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

موطا | موطا قرآن پاک کے بعد کتب خانہ اسلام کی دوسری کتاب ہے۔ اول کلام خدا ہے اور ثانی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جیسا کہ محدثین کرام نے اس کی تصریح کی ہے کہ موطا ہی نقش اول اور بنیادی کتاب ہے۔ بخاری کی حیثیت تو اس باب میں نقش ثانی کی ہے۔ اور انہیں دونوں کتابوں پر مسلم و ترمذی جیسے بعد کے مؤلفین نے اپنی کتابوں کی بنا رکھی ہے۔

موطا درحقیقت علوم مدینہ کا مجموعہ ہے جس کو امام دارالہجرۃ مالکؒ بن انس نے جمع کیا ہے۔ موطا ان تمام اکابر صحابہ و اعاظم تابعین جن کا مسکن مدینہ منورہ تھا۔ ان کی روایات و فتاوی پر مبنی ہے اور بقول امام شاہ ولی اللہ دہلوی۔

"صحیح ترین، موثق ترین، اور کامل ترین احکام اسلامیہ کا مجموعہ ہے"[2]۔

اور محی السنۃ نواب صدیق حسن خاں مرحوم اتحاف البلاء میں ابوزرعہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

وایں وثوق واعتماد بہ کتب دیگر نیست

کہ یہ مجموعہ وثوق واعتماد میں تمام کتابوں[3] میں فوقیت رکھتا ہے۔

زمانۂ تالیف | موطا کی تالیف مدینہ منورہ میں ہوئی۔ اس لیے کہ امام صاحب تمام عمر مدینہ میں ہی رہے۔ تالیف زمانہ کے متعلق صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن بقرائن معلوم ہوتا ہے کہ موطا کی تالیف کا زمانہ ۱۳۰ھ تا ۱۴۰ھ کے درمیان ہے۔

---

[1] ماخوذ از حیات امام مالک از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۷۹

[2] مقدمہ مسوی شرح موطا از امام ولی اللہ دہلوی۔

[3] اتحاف البلاء ص ۱۶۵

سنہ ۱۳۰ھ میں بنی امیہ کا زوال شروع ہوا۔ اس سے پہلے تصنیف و تالیف کا شغل نہ تھا۔ سنہ ۱۴۲ھ میں منصور نے آخری حج کیا۔ اس وقت موطا منصۂ شہود پر آ چکی تھی۔ اس لیے موطا کا زمانہ تالیف ان دونوں کا درمیانی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔[1]

وجہ تسمیہ لفظ "موطا" وطیہ کا مفعول ہے۔ صاحبِ قاموس نے اس کے معنی روندنے، تیار کرنے اور نرم وسہل بنانے کے بیان کیے ہیں۔ "موطا" کے لغوی معنی "روندا ہوا۔ تیار کیا ہوا، نرم اور سہل بنایا ہوا" ہیں۔ یہ تمام معانی بطور استعارہ کے یہاں مراد لیے جا سکتے ہیں۔[2]

امام شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں۔

موطا کے لغوی معنی روندے ہوئے یا چلے ہوئے اور مجازی معنی یہ ہیں کہ جس پر عام ائمہ اور علماء اور اکابر چلے ہوں اور جس کو ان سب کی رایوں نے روندا اور پامال کیا ہو۔ یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو، اور اس سے اتفاق کیا ہو۔[3]

اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں۔

"موطا" اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر لوگ بکثرت گزرتے ہیں۔ سنت کے معنی بھی راستہ کے ہیں جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گزر گئے اور تمام صحابہؓ گزرے۔ غرض موطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ یہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہؓ کا عمل رہا ہے، اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔[4]

ابوحاتم رازی سے دریافت کیا گیا کہ اس کا "موطا" کیوں نام رکھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ امام مالکؒ نے اس کو مرتب کر کے لوگوں کے لیے سہل بنا دیا ہے اور خود امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو لکھ کر مدینہ کے ۰۰ فقہائے عظام کے سامنے پیش کیا۔ سب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

---

[1] حیات امام مالک ص ۸۴

[2] قاموس جلد ۱ ص ۲۲

[3] مقدمہ مسوی شرح موطا ص ۶

[4] حیات امام مالکؒ ص ۸۷

مؤطا کی غرض | مؤطا سے پہلے اور خود امام مالک کے زمانے میں حدیث کے بہت سے مجموعے تیار ہو چکے تھے۔ مگر ان میں صحت کا اتنا التزام نہیں تھا، جو التزام مؤطا میں رکھا گیا ہے اور مؤطا کی صحت کے التزام کے سلسلے میں محدثین کرام نے اس کی نشان دہی کی ہے[1]۔

حافظ ابن حبان فرماتے ہیں۔

"امام مالکؒ فقہائے مدینہ میں سے سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے رواۃ کے متعلق تحقیق سے کام لیا۔ اور حدیث میں جو ثقہ نہ ہوں، اُن کی روایت سے اعراض کیا۔ وہ صحیح روایات کے علاوہ نہ کوئی روایت نقل کرتے ہیں اور نہ کسی غیر ثقہ سے حدیث بیان کرتے ہیں[2]۔

اور امام شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں۔

کہ امام دار الہجرۃ مالک بن انس کے مذہب کی بناء اوّل احادیث صحیحہ اور بنائے ثانی آثار صحابہ و تابعین ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"جاننا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے خواہ مسند ہو یا مرسل نیز حضرت عمرؓ کے اثر اور عبد اللہ بن عمرؓ کے عمل سے استدلال کرنا اور صحابہ و تابعین مدینہ کے فتاویٰ سے اخذ کرنا خصوصاً جب کہ ان تابعین کی ایک جماعت کسی مسئلہ پر متفق ہو۔ امام مالکؒ کے مذہب کا اصول ہے[3]۔

مؤطا کا کتب حدیث میں مقام | جمہور علمائے کرام نے طبقات کتب حدیث میں مؤطا کو طبقہ اولیٰ میں شمار کیا ہے۔ امام ولی اللہ دہلوی نے کتب حدیث کے پانچ طبقات قائم کیے ہیں۔ اور "مؤطا" کو طبقۂ اولیٰ میں شمار کیا ہے۔

---

[1] تہذیب التہذیب امام ابن حجر عسقلانی ترجمہ امام مالکؒ

[2] کتاب الثقات ابن حبان

[3] مصفیٰ شرح مؤطا جلد اوّل ص ۱۰

طبقہ اولیٰ میں صرف وہ تصانیف ہیں جن کے مصنفین حدیث کے امام اور فن کے نقاد تھے، اور جن کی تصانیف صحت، جودت اسناد اور قبول محدثین کے لحاظ سے سب سے مقدم ہیں اور جن کے رجال حفظ، ثبوت، وثوق اور شہرت میں معروف ہیں۔

طبقہ ثانیہ میں اس سے کم درجہ وعلی ہذا ترتیب۔

طبقہ اولیٰ میں مؤطا، بخاری اور مسلم داخل ہیں اور طبقہ ثانیہ میں ترمذی، نسائی اور ابوداؤد شامل ہیں۔

امام ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں۔

واتفق اھل الحدیث علی ان جمیع ما فیہ علی رای مالک ومن وافقہ واما علی رای غیرہ لیس فیہ مرسل ولا منقطع الا وقد اتصل السند بہ من طرق اخری فلا جرم انھا صحیحۃ من ھذا الوجہ[1]

محدثین کا اتفاق ہے کہ اس کتاب کی تمام روایات امام مالک اور ان کے موافقین کی رائے میں صحیح ہیں، اور دوسروں کی رائے بھی اس سلسلہ میں یہی ہے کہ موطا کی مرسل و منقطع روایات کی سند دوسرے طرق سے متصل ہے۔ پس اس میں کوئی شبہ نہ رہا کہ اس اعتبار سے وہ سب صحیح ہیں۔

امام شافعیؒ کی شہادت امام شافعیؒ المتوفی ۲۰۴ھ جو امام مالکؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ مؤطا کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ما علی ظھر الارض من کتاب اللہ اصح من کتاب مالک[2]

روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں۔

مؤطا کی مقبولیت امام شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کی حیات ہی میں یہ کتاب

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۱۳۳ [2] حیات امام مالک ص ۹۱

پوری دُنیائے اسلام میں مشہور ہو گئی تھی۔ جتنا زمانہ گزرتا گیا۔ اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور لوگوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اس مقدس کتاب کی تنہا خصوصیت یہ ہے کہ سلاطین زمانہ، مہدی، ہادی، رشید، مامون اور امین جیسے مشاہیر خلفائے اسلام نے عراق سے حجاز تک بادیہ پیمائی کی[1]

روایات کی تعداد ابتداء موطا میں دس ہزار احادیث تھیں۔ مگر امام صاحب نے سب کو قلم زد کر دیا۔ اب ۱۷۲۰ باقی ہیں جس کی تفصیل یہ ہے۔

مسند مرفوع	۶۰۰
مرسل	۲۲۲
موقوف	۶۱۳
تابعین کے اقوال و فتاویٰ	۲۸۵
میزان	۱۷۲۰

مؤطا کی شروح، تعلیقات، تجریدیں، اسناد، رجال وغیرہ مؤطا کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ اس کو شارحین، معلقین، و محشیں کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئی ہے۔ علمائے مالکیہ کے علاوہ دوسرے حضرات نے بھی موطا کی خدمت کی ہے۔ قاضی عیاض نے اُن کی تعداد ۹۹ بتائی ہے۔ اور اس کے بعد بھی اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں مؤطا کی شروح و تعلیقات کا تعارف مقصود نہیں۔ صرف موطا کی مقبولیت کی نشان دہی کرنا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے حیات امام مالک میں بحوالہ کشف الظنون لفظ موطا اور مدارک قاضی عیاض سے بواسطہ تزئین الممالک سیوطی صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۸ سے شروح موطا کی ایک فہرست دی ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

شروح مؤطا	۲۹
تجرید و اسناد مؤطا	۱۶

[1] مسوّی شرح مؤطا۔

اختلاف مؤطاآت	۲
رجال المؤطا	۵
غریب المؤطا	۴
روایت المؤطا عن المالک	۳
متفرق مباحث	۷
میزان	۶۶

صفات کے مسئلہ میں امام مالک کا مسلک صحبت نبوی کے فیوض اس درجہ کم ہوتے گئے اور صحابہ کرام ایک ایک کر کے جس انداز سے دنیا سے رخصت ہوتے۔ ایقان وبصیرت کے درخشاں نمونوں کی تجلیات اسی نسبت سے گھٹتی چلی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری صدی کے اوائل میں عقلی شکوک وشبہات نے دلوں میں راہ پائی۔ کیونکہ جس طرح طبیعیات کا یہ اصول ہے کہ خلا محال ہے۔ اسی طرح قلب و دماغ کی معموری کا بھی یہی حال ہے اس کا خالی رہنا بھی ناممکن ہے۔ اگر ایمان کی معموریاں اس کو رونق نہیں بخشیں گی تو پھر الحاد و زندقہ کا اس میں دخل ہو جائے گا۔

امام صاحب کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے صفات کے مسئلوں پر موشگافیاں شروع کر دی تھیں۔ حضرت امام نے جب پہلی دفعہ یہ سوال سنا کہ "استواء علی العرش" کے کیا معنی ہیں تو انہیں اس اندازِ فکر سے سخت ملال ہوا۔ دیر تک گردن جھکائے سوچتے رہے۔ پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ بالآخر جواب میں ایسے جامع کلمات ارشاد فرمائے جو آئندہ چل کر علم کلام میں ایک مستقل مدرسہ قرار پائے۔ یعنی:

الاستواء معلوم، والکیف مجہول، والایمان واجب،
والسؤال عنہ بدعۃ

اللہ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے۔ کیف نہیں جانتے۔ ماننا ضروری ہے۔
اور اس میں میخ نکالنا بدعت ہے۔

وفات امام صاحب کی عمر ۸۶ سال کی ہو چکی تھی۔ نہایت ضعیف اور ناتواں ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود درس وافتاء کا سلسلہ جاری رکھا۔ اتوار کے روز بیمار ہوئے اور تقریباً تین ہفتہ بیمار

رہے۔ مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی۔ بالآخر ۱۱ ربیع الاوّل ۱۷۹ھ میں انتقال فرمایا۔
۸۶ سال کی عمر پائی۔ ۱۱۷ھ میں مسندِ درس پر قدم رکھا۔ اور ۶۲ سال تک علم و دین کی خدمت سرانجام دی۔

جنازہ میں ایک خلقت کا ہجوم تھا۔ والی مدینہ عبد اللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ پا شریک تھا۔ اور نعش اٹھانے والوں میں شریک تھا۔ جنت البقیع ایک مشہور مقام ہے۔ یہاں صرف وہ لوگ لیٹے ہیں جو حیاتِ اولیٰ کے منازل طے کر چکے ہیں۔

اسلام کے ارکانِ عظام امیر المومنین حضرت عثمان رضؓ، ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ، سیدۃ النساء اہل الجنۃ حضرت فاطمۃ الزہرا، حضرت امام حسنؓ اور ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر اعلام اسلام اسی خاک میں مدفون ہیں۔ امام مدینہ کا جسد خاکی بھی اسی خاک کو سپرد ہوا۔

رسائل و مسائل

ابن جریرؒ طبری کا مسلک

جناب ملک غلام علی صاحب

سوال:- سیارہ ڈائجسٹ کے "سید مودودی نمبر" میں ایک مضمون "سید مودودی اور اقبالؒ" کے زیرِ عنوان صابر کلوروی صاحب کے قلم سے چھپا ہے۔ اس میں مولاناؒ مرحوم سے ملاقات، گفتگو وغیرہ کے سلسلے میں جیلانی صاحب اور آپ کا ذکر بھی ہے۔ صابر صاحب نے مولانا محترم سے جو سوالات پوچھے اُن میں ایک یہ تھا کہ ابن جریر طبری کیا شیعہ یا اُن کے نقطۂ نظر کا حامی تھا تو مولاناؒ نے جواب میں فرمایا کہ ایسا سمجھنا درست نہیں ہے اور اس موقع پر چند مثالیں بھی دیں مگر صابر صاحب لکھتے ہیں "افسوس ہے کہ اب یہ مثالیں مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں رہیں"۔

آپ نے اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ" میں بھی بسبیل تذکرہ اس الزام کو نقل کیا ہے کہ بعض حضرات ابن جریر کو شیعہ کہتے ہیں۔ مگر اس کے جواب میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ یہ اعتراض و الزام بالکل بے جا ہے اور جو باتیں ابن جریر نے لکھی ہیں وہ دوسرے مورخین و مصنفین نے بھی لکھی ہیں۔ مگر اس سے شیعیت والے الزام کی پوری طرح تردید نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس مجلس میں شریک تھے اور آپ کو مولانا محترم کے ارشادات یاد ہوں تو آپ اُن کی تفصیل یا کم از کم خلاصہ ترجمان میں دے دیں کیونکہ یہ اعتراض اب بھی بعض حلقوں میں دہرایا جاتا ہے۔

جواب:- مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی جس گفتگو کا حوالہ آپ نے دیا ہے وہ اب میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہی۔ میری قوتِ حافظہ امراض کے باعث پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی، اس پر مستزاد مرحوم و مغفور کی رحلت کا صدمہ و سانحہ ہے جس نے میری یادداشت کو بالکل محو اور ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ہے۔

؎ فرداوِ دَے کے تفرقے یک بار مٹ گئے وہ کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

میں سمجھتا ہوں کہ "خلافت و ملوکیت" کے آخر میں "ماخذ کی بحث" کے زیرِ عنوان ابن جریر طبری کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل کافی و شافی ہے۔ معلوم نہیں یہ حصہ آپ کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں۔ اس میں متعدد ائمہ اہلِ سنت کی آرا امام ابن جریر کے متعلق نقل کر دی گئی ہیں اور حاشیے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ابن جریر نام کے ایک مصنف شیعہ بھی تھے جن کے حالات اصحاب رجال نے الگ بیان کیے ہیں۔

میں نے جب ترجمان میں ابن جریر طبری پر تشیع کے الزام کا ذکر کیا تھا تو اُسے پڑھ کر ہندوستان کے ایک عالمِ دین نے (جو لیبیا میں تھے اور جن کا اسم گرامی یاد نہیں پڑتا) اس الزام کے رد میں ایک مفصل مضمون "فاران" میں شائع کرایا تھا۔ متعدد دیگر اہلِ علم نے بھی اس کی تردید کی اور ثابت کیا ہے کہ ابن جریر طبری شیعہ نہیں تھے، بلکہ تفسیر، تاریخ، فقہ اور دیگر علوم میں اہلِ سنت کے بلند پایہ اور جلیل القدر امام ہیں۔

تاہم میں نمونے کے طور پر ابن جریر کے باب میں چند مزید اقوال —— دوسروں کے اور خود اُن کے۔ نقل کیے دیتا ہوں اور فیصلہ طالبین حق و انصاف پر چھوڑتا ہوں

تفسیر ابن جریر کا جو نسخہ مصر میں سیّد عمر الخشاب کے اہتمام سے مطبع المیریہ بولاق میں ۱۳۲۳ھ میں چھپا ہے اس کے آغاز میں امام جلال الدین سیوطی کی رائے الاتقان سے یوں نقل کی گئی ہے۔

وکتابه اجل التفاسیر واعظمها فانه یعرض لتوجیه الاقوال وترجیح بعضها علی بعض والاعراب والاستنباط فهو یفوق بذلك علی تفاسیر الاقدمین۔

(ابن جریر طبری کی تفسیر سب تفسیروں سے زیادہ جلیل القدر اور عظیم الشان ہے۔ وہ مختلف اقوال کی توجیہ و تاویل کے بعد بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں اور توضیح و استنباط کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ پہلے کی تفاسیر پر فوقیت رکھتی ہے)۔

امام محی الدین نووی فرماتے ہیں:۔

اجمعت الامة علی انه لم یصنف مثل تفسیر الطبری۔

(امت کا اس پر اجماع ہے کہ طبری کی تفسیر جیسی کوئی تصنیف نہیں لکھی گئی)۔

امام ابو حامد اسفرائینی لکھتے ہیں :۔

لوسافر رجل الی الصین حتیٰ یحصل له تفسیر ابن جریر لم یکن ذلک کثیرا۔

(اگر کسی کو چین تک کا سفر محض اس لیے کرنا پڑے کہ اُسے تفسیر ابن جریر حاصل ہو تو یہ بڑی بات نہ ہوگی)

اس کے بعد اب میں ایک دو اقتباسات خود امام ابن جریر طبری کے ان کی تفسیر ہی سے نقل کرتا ہوں۔ اپنی تفسیر کے آغاز ہی میں سورہ فاتحہ کی آیت اھدنا الصراط المستقیم میں دیکھیے کہ وہ صراط مستقیم کی تشریح میں کیا لکھتے ہیں۔ پہلے تو وہ اسی تاویل کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس "سیدھی راہ" کا اولین تعلق اسی دنیا اور حیات دنیوی کی ہدایت سے ہے۔ پھر فرماتے ہیں :۔

والذی ھو اولیٰ بتاویل ھٰذہ الایۃ عندی ان یکون معنیاً بہ وفقنا للثبات علی ما ارتضیتہ ووفقت له من انعمت علیہ من عبادک من قول وعمل وذٰلک ھو الصراط المستقیم۔ لان من وفق لما وفق له من انعم اللہ علیہ من النبیین والصدیقین والشھداء فقد وفق للاسلام وتصدیق الرسل والتمسک بالکتاب والعمل بما امر اللہ بہ والانزجار عما زجرہ عنہ واتباع منھج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومنھاج ابی بکر وعمر وعثمان وعلی وکل عبد اللہ الصالح وکل ذلک من الصراط المستقیم۔"

(آیت اھدنا الصراط المستقیم کی سب سے بہتر اور اقرب الی الصواب تاویل میرے نزدیک یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اے اللہ ہمیں اس قول و عمل پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرما جو تجھے پسند ہے اور جس کی توفیق تو نے اپنے انعام یافتہ بندوں کو بخشی اور یہی صراط مستقیم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات سے سرفراز ہونے والے انبیاء، صدیقین، اور شہداء کو جس عمل کی توفیق عطا ہوئی، اس کی توفیق جسے بھی دی گئی اُسے دوسرے لفظوں میں اسلام لانے، رسولوں کی تصدیق کرنے اور کتاب اللہ سے تمسک کرنے اور اللہ کے احکام

اوامر بجالانے کی اور نواہی سے بچنے کی توفیق ارزانی ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ اور ہر نیک بندے کے طریق پر چلنے کی توفیق دی گئی اور یہ سب کا سب صراط مستقیم ہی میں شامل ہے۔

اس کے بعد ذرا آگے چل کر ابن جریر پوری سند کے ساتھ ابوالعالیہؒ سے صراط مستقیم کی تفسیر عاصمؒ کی زبانی یوں نقل کرتے ہیں:-

قال هو رسول الله صلى الله عليه وسلم وصاحباه من بعده ابوبكر وعمر قال فذكرت ذلك للحسن فقال صدق ابو العاليه ونصح

(عاصم راوی ہیں کہ ابوالعالیہ نے فرمایا کہ سیدھی راہ پر چلنے والے جن پر انعام ہوا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دو رفیق آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔ عاصم کہتے ہیں کہ میں نے ابوالعالیہ کا یہ ارشاد حضرت حسنؒ بصری کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا۔

ابوالعالیہ نے سچ کہا اور خالص خیر خواہی کی بات کہی۔

اب سوال یہ ہے کہ جس شخص کا ادنیٰ درجے میں بھی میلان تشیع کی جانب ہو، کیا وہ اپنی تفسیر کی بسم اللہ اس انداز سے کرے گا؟ صراط مستقیم کی تاویل و توضیح میں جو کچھ ابن جریر نے لکھا ہے کیا سلف صالح اور اہل سنت کے مسلک سے اس میں سرِ مو بھی انحراف پایا جاتا ہے؟ ابن جریر نہایت صراحت کے ساتھ خلفائے راشدین اربعہ کو انبیاء کی معیت میں شمار کر رہے ہیں اور انہیں صدیقین و شہداء کے زمرے میں شامل قرار دے رہے ہیں۔ پھر وہ چاروں خلفاء کی وہی ترتیب بیان کر رہے ہیں جو اہل سنت کے ہاں مسلّم و مروّج ہے اور حضرت علی کا ذکر آخر میں کر رہے ہیں۔ جو شخص اس نظریہ و عقیدہ کا حامل ہے، ظاہر ہے کہ وہ ہر نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے وقت جب سیدھی راہ کی جانب ہدایت کی دعا مانگے گا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کے ذہن میں خلفائے راشدین ہی کا اسوہ و طریقہ اور ان کی سنت کا نقشہ

لہ ابوالعالیہ بن مہران اور عاصم بن سلیمان دونوں کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے جن کی ثقاہت و عدالت پر اتفاق ہے۔ غ

اور تصور ہو گا۔ اگر ایسا فرد بھی شیعہ ہے تو پھر معلوم نہیں سنی کی تعریف کیا ہے اور اسے کہاں سے تلاش کیا جائے گا۔

باقی رہی یہ بحث کہ ابن جریر کی تفسیر یا تاریخ میں بعض اقوال محل نظر ہیں، تو ہم کب کہتے ہیں کہ وہ امام معصوم ہیں اور ان کی ہر بات قابل قبول ہے۔ ابن کثیر جنہوں نے اپنی تفسیر و تاریخ میں چھنتا ہوا علمی ذخیرہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے کیا ان کے ہاں کی ہر شے قابل اخذ ہے؟ ہمارے اسلاف کا یہ علمی و فکری ورثہ جو ہم تک پہنچا ہے اس کے معاملے میں خُذ ما صفیٰ ودع ما کدر (جو صاف ہے اسے لے لو، جو ناصاف ہے اسے چھوڑ دو) کا اصول اختیار کرنا چاہیے جو چیز اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ سے مطابقت رکھتی ہے وہ بسر و چشم قبول ہے، جو مطابقت نہیں رکھتی وہ ناقابل قبول ہے۔

بقیہ مطبوعات

کر کے کسی ایک یا دو کے خلاف زور ڈالتے رہیں گے۔

نتیجہ یہ کہ عالم اسلام تو کجا، خود پاکستان میں بھی فضا اسلام یا وحدت پاکستان جیسے اعلیٰ مقاصد پر بھی اختلافی آراء کا ٹکراؤ جاری ہے۔

بہر حال مولانا محمد تقی عثمانی سے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اس بنیادی مسئلے پر مزید کاوش کریں گے۔

مطبوعات

تاریخ تفسیر و مفسرین
مؤلفہ: پروفیسر غلام احمد حریری
صدر شعبہ اسلامیات
اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور
ناشر: ملک سنز پبلشرز۔ کارخانہ بازار
فیصل آباد
مجلد ۴۲۴ صفحات۔ قیمت: ۴۵/- روپے

موضوع وقیع ہے اور مؤلف فاضل۔ قرآن کا پیغام جاننے کے لیے تفسیر کی بڑی اہمیت ہے۔ آیات کے نزول کا ماحول، سلسلۂ کلام، الفاظ اور مصطلحات کے مفاہیم، اسلوب بیان کی نوعیت بلحاظ قواعد و بلاغت، ناسخ منسوخ، تاریخی واقعات اور سیرت و سوانح کے شواہد، ضمیروں کے مرجعے، غرض قرآن کی بات سمجھنے کے لیے بہت سی معلومات کی مدد لینی پڑتی ہے۔ قرآن کو آسان بنایا گیا ہے تو وہ اس معنی میں نہیں کہ نہ لغت کی ضرورت، نہ تاریخ کی، نہ عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان کی، بلکہ کوئی بدوی، جاہل، دورِ نزولِ قرآن سے کسی بعید زمانے کا آدمی خود ہی پڑھ کر ایمانیات، اوامر و نواہی اور دوسری تلقینات کو خود ہی پا سکتا ہے۔ قرآن آسان ہے، مگر تدبر کرنے کے بعد۔

قرآن کا پہلا مفسر خود قرآن ہے، دوسرا مفسر خود رسولؐ اور سنتِ رسول ہے، تیسرا مفسر صحابہ کرامؓ کا سماج اور اس کے متفقہ قبول کردہ رویے ہیں، چوتھے نمبر پر صحابہ کرامؓ کی انفرادی معلومات ہیں۔ پھر وہ تمام تفسیری مساعی اہمیت رکھتی ہیں جو تابعین اور تبع تابعین سے لے کر آج تک سلیم الطبع حضرات یا صحیح الاساس اداروں کی طرف سے کی جا رہی ہیں۔

پروفیسر حریری صاحب نے تفسیر کی ماہیت، اس کے اصولوں، اسلف کی تفاسیر اور جدید دور کی تفاسیر کا تعارف بھی کرایا ہے اور فلسفہ زدہ یا انکارِ حدیث پر مبنی یا جدت طرازانہ تفسیروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ تفسیروں کے مندرجات بطور مثال بھی پیش فرمائے ہیں۔

یہ کتاب جتنی مفید اعلیٰ مدارج کے طلباءِ اسلامیات و تفاسیر کے لیے ہے اتنی ہی ضروری یہ عام اہلِ ذوق کے لیے بھی ہے۔

عصرِ حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو؟

مؤلف: مولینا محمد تقی عثمانی

ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی

قیمت مجلد ۳۴، صفحات ۲/ ۴۰ روپے

لائق مقدر مؤلف اپنی قابلیت کے علاوہ جذبۂ اصلاحِ احوال کے لحاظ سے بھی خاص مقام رکھتے ہیں اور مفتی محمد شفیع صاحب مغفور کے خلف اور جانشین ہونے کے لحاظ سے بھی ہماری نگاہ میں قابلِ احترام ہیں۔

مولینا نے مسئلہ بہت اہم چھیڑا ہے جس سے پاکستان میں خصوصاً اور پورے عالمِ اسلام میں مجموعی طور پر ہمیں سابقہ درپیش ہے۔ مسئلہ دستور سے لے کر معیشت اور تعلیم اور معاشرت تک کے مباحث کتاب میں شامل ہیں۔ اسلام اور سائنس اور نئے وسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ عالمِ اسلام کے احوال بھی زیرِ غور لائے گئے ہیں۔ قادیانیت پر خاص باب الگ ہے۔ متفرقات میں پہنچ کر ایک مسئلہ ایسا سامنے آتا ہے کہ جو ہے بہت ہی سادہ اور جس سے بات کرو وہی اس کی شدید ضرورت تسلیم کرتا ہے، مگر جتنے بھی حل بتائے جاتے ہیں اُن کے مطابق کوئی عملی مثال پیدا نہیں ہوتی۔ مسئلہ ہے اتحاد کا، اتحاد کے بغیر اسلام کا نفاذ قطعی طور پر ناقابلِ تصور ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی نے نمبروار اس کے لیے جو عملی شرائط لکھے ہیں، اُن سے بڑی حد تک اتفاق کرتے ہوئے بھی میں یہی کہوں گا کہ ان خوبصورت اقوال پر کاربند کوئی بھی نہیں۔ اختلافی نزاعات میں شیطان نے مزہ ایسا بھر دیا ہے اور زجر و توبیخ اور طنز و تعریض کرنے سے گفتگو اتنی چٹ پٹی ہو جاتی ہے کہ مشکل ہی کوئی ذہین آدمی پرہیز کوڑے سے بغیر رہ سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے تلخ جذبات اور لپیٹ رجحانات کو اگلنے کے لیے مصنوعی احترام و انکسار کا ایک ایسا پیرایہ ایجاد کیا ہے کہ بسا اوقات وہ طنز و زجر سے بھی زیادہ چبھن پیدا کر دیتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جب بھی کوئی قضیہ دل میں آئے تو اولاً بالمشافہ گفتگو ہی سے شخص متعلق کے سامنے لانا چاہیے۔ پھر بھی اگر ضرورت ہو تو اس پر لکھا یا بولا جائے تو انداز گفتگو کا معیار وہ ہو جو خود اپنے خاص گروہ کے قابلِ ذکر افراد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ایسی گفتگو میں بھی کسی شخص خاص یا گروہ خاص کو نشانہ بنائے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ دین میں فلاں مسئلہ یوں ہے، یا فلاں معاملے میں حلال و حرام کی حدود یہ ہیں یا کسی نقطۂ نظر میں اتنا جزو درست ہے اور اتنا غلط۔

اب دیکھیے کہ افغانستان کے مہاجرین لڑ رہے ہیں مگر پوری طرح متحد نہیں ہیں۔ عالمِ اسلام بڑی آزمائش سے گزر رہا ہے مگر بنیان مرصوص نہیں ہے۔ اتحاد کی کانفرنسیں ہو جائیں گی مگر اختلاف اور معارضہ اسی طرح رہے گا۔ متحدہ محاذ میں بھی مختلف عناصر جمع ہو جائیں گے مگر ادھر اُدھر بیٹھ کر اپنے ہی اتحادیوں کے بارے میں کہتے پھریں گے کہ وہ تو منافق لوگ ہیں ۔۔۔ اور پھر محاذ اتحاد کے اندر جتھہ بندی (باقی بر صفحہ ۴۱)

(بقیہ اشارات) اس متحدہ محاذ میں بھی رخنے موجود ہیں۔ مثلاً مغربی جرمنی اور فرانس دونوں کا خیال یہ ہے کہ ہم امریکہ کا ساتھ دیں گے مگر امریکہ سے دوستانہ روابط کی کوشش جاری رہنی چاہیئے۔

۷۔ امریکہ نے روسی جارحیت کے خلاف جو تدابیر اختیار کی ہیں وہ کسی جنگی کارروائی اور بڑے خطرے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً معاملے کو سلامتی کونسل میں لے جانا (جہاں ویٹو کرنے کے لئے روس موجود تھا) پھر جنرل اسمبلی میں ایک کمزور سی قرارداد پاس کرانا جس میں بات اصولی ہے۔ روس کا نام تک نہیں لیا گیا۔ یہ سست کار سرسری طریقے ہیں۔

دوسری تدبیر یہ ہے کہ روس، امریکہ اور دوسرے ممالک سے غلہ نہ خرید سکے۔ مگر ابھی تو اس نے سال چھ ماہ کے لئے غذائی ضروریات کا اسٹاک اقدام سے پہلے کر لیا ہوگا۔ پھر روس نے حالیہ فیصلے سے قبل امریکہ سے ضرورت کے وافر اسٹاک خرید لئے ہیں۔ خرید کردہ سٹاک کو روکنے کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ خریداری کی بندش امریکی کسانوں کو ناپسند ہے، کیونکہ غلہ کی قیمتیں گر گئی ہیں۔ یہ کسان صدارتی انتخاب کے ووٹر بھی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ امریکہ نے، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ کو "غلہ روک" پالیسی پر ہم آہنگ کر لیا ہے۔ لیکن اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ روہوڈیشیا کی طرح روس کے خلاف عائد کردہ پابندیوں ہی کو کچھ ممالک خفیہ اسمگلنگ سے بے اثر نہ کر دیں گے۔

تیسری تدبیر یہ ہے کہ روس کو جو اعلیٰ سائنٹیفک ٹیکنالوجی (کمپیوٹر وغیرہ) فراہم کی جا رہی تھی اسے روک دیا جائے۔ مگر ایک تو مکمل تجارتی انقطاع کی بات چھڑی نہیں دوسرے فرانس اور مغربی جرمنی کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں تعلقات کو توڑنا نہیں بلکہ دیتانت اور سالٹ دوم وغیرہ کی شکل میں جو کوششیں ہوئی ہیں انہیں آگے بڑھانا چاہئے۔ نیز تجارت ہوتی رہے۔

چوتھی تدبیر یہ ہے کہ روس میں منعقد ہونے والے اولمپکس سے بائیکاٹ کیا جائے۔ اول تو اس پر اتفاق نہیں۔ ہو بھی تو کھیلوں کا بائیکاٹ نہ تو کسی بڑی مالی چوٹ کا ذریعہ ہے اور نہ ان طریقوں سے جارحیت کا قدم رک سکتا ہے۔

۸۔ بلاشبہ مسلم ممالک بھی خود اپنے مفاد کو ملحوظ رکھ کر متحرک ہو گئے ہیں۔ اور یہ چیز بھی امریکہ کے حق میں ہے۔ مگر مسلم ممالک کا بھی ایک تو طریق کار یہ ہے کہ کانفرنسیں منعقد کرنے کی طرف توجہ دیں، دوسرے یہ کہ ان میں اختلافی رو بھی موجود ہے۔ جیسے کہ اسلام آباد میں بین الاسلامی کانفرنس کے انعقاد کے خلاف

روس کے زیر اثر ملکوں نے کھلم کھلا اختلافی اظہار کیا ہے۔ نیز ان ممالک کا پہلے سے روس سے مفاد وابستہ ہے

یہ ہے امریکہ کی پوزیشن جو روسی جارحیت کے مخالف محاذ کا نمایاں سربراہ ہے۔

پاکستان کے بننے سے لے کر ابتک کے سارے ہی معاملات عقل کو چکرا دینے والے ہیں یہی پاکستان جس کا وجود بھارت کے مقابلے میں اہل مغرب کو کبھی قابلِ وقعت محسوس نہیں ہوا تھا اور "اسلامی بم" کی افسانہ طرازی کر کے جس کو مجرم ٹھہرایا گیا۔ اور سزا ہی کے طور پر ہر قسم کی امداد بند کر دی گئی، اب یکایک اسے کہا جاتا ہے کہ ہم امداد دینا چاہتے ہیں۔ قبول کرو۔ تم ضرورت مند ہو۔

آج سب کو پاکستان سیاسی جغرافیت کے لحاظ سے بے حد اہم ملک محسوس ہونے لگا ہے، اور ہر طرف دوستی کے آبشار امڈنے لگے ہیں۔

ہماری حکومت نے اِن حالات میں مناسب رویہ اختیار کیا کہ امداد کی پیشکش پر بغلیں بجانے کے بجائے، ٹھہراؤ سے دریافت کیا کہ یہ ایڈ وغیرہ کا کیا قصہ ہے؟ کیوں دینا چاہتے ہیں؟ کس مقدار میں؟ کن شرائط کے ساتھ، پھر یہ مطالبہ بھی سامنے آیا کہ امریکہ کو اگر دوستانہ تعلقات رکھنے ہوں تو وہ اس امر کی ضمانت دے کہ نازک حالات میں وہ کنارہ کشی نہ کر جائے گا جیسے کہ پہلے وہ مثالیں قائم کر چکا ہے۔

بہرحال روسی خطرہ دروازے پر ہے، فوجی قوت اور اسلحہ کی وافر مقدار مطلوب ہے، پیش کش ہو رہی ہے، اور امریکہ پاکستان کی محبت میں وارفتہ ہو کر نہیں، بلکہ اپنے مفاد و مشکلات کے زیر اثر کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہے۔

ہمارا کام یہ ہے کہ ہم چند پہلوؤں پر مضبوطی سے قائم رہیں۔

۱۔ فوجی امداد محض خانہ پُری کے طور پر نہ ہونی چاہیے بلکہ جدید ترین سامان اتنی بڑی مقدار میں ہو کہ روس جیسی قوت کے سامنے پاکستان کھڑا ہو سکے۔ ہمیں سیدھی اُڑان کرنے والے جدید طیارے بھاری مقدار میں چاہییں، میزائیلوں کے اڈوں اور راکٹوں کی ضرورت ہے۔ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں چاہییں۔ بانی کے لیے سرحدوں پر راڈار کا وسیع انتظام چاہیے۔ سمندر میں طیارہ بردار اور تباہ کن جہازوں کے علاوہ میزائیل بردار آبدوزوں کی ضرورت ہے۔

۲۔ محض اسلحہ کی امداد سے کام نہیں چلتا۔ جنگی قوت کے پیچھے مضبوط اقتصادی اور صنعتی قوت ہونی چاہیے بہت سی پکی سڑکیں یا ریلوے لائنیں بنانی پڑ سکتی ہیں۔ دو ایک جگہ پہاڑوں میں سوراخ کر کے راستے بنانے کی ضرورت ہے۔ سکھر کے پل کا متبادل بھی ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں صدر پاکستان نے ۴۰ کروڑ ڈالر کی اعلان کردہ امداد کو بے وقعت قرار دے کر اچھا کیا ہے۔ ستم یہ کہ بھارت کے لیے روس کی بھاری امداد کا اعلان ہو گیا ہے۔

۳۔ اس امداد کے ساتھ ایسی شرائط نہ ہونی چاہییں جو ہماری آزادی و سالمیت پر اثر انداز ہوں یا امریکہ ہماری پالیسیوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی راہیں نکالے۔ خصوصاً احیائے اسلام کے سلسلے میں ہماری مساعی میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ نیز مغرب کے تہذیبی و معاشرتی مفاسد کو ہم پر نہ ٹھونسا جائے۔

۴۔ یہ اصولی بات پہلے دن سے واضح رہنی چاہیے کہ پاکستان کسی دوسرے کی جنگ نہیں لڑے گا۔ صرف اپنی جنگ لڑے گا۔ اُسے آلۂ کار بنا کر استعمال نہ کیا جائے۔

۵۔ جیسا کہ پہلے بات آ چکی ہے، امریکہ کو ضمانت دینی چاہیے کہ وہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء جیسا رویہ اختیار کرے گا بلکہ پاکستان پر اگر مشکل وقت آئے تو وہ حق ادا کرے گا۔ صدر پاکستان نے ایک نئے معاہدۂ دوستی کی تجویز اسی ضرورت سے کی تھی۔ صدر کارٹر کا کہنا ہے کہ ایسے معاہدے کی منظوری میں کانگریس سے لینے میں دیر لگ جائے گی۔ بدرجۂ آخر اس کا علاج یہ ہے کہ صدر کارٹر اقوام متحدہ کے اجلاس میں اپنے اب تک کے واضح کردہ نقطۂ نظر کو ڈیکلیئر کر کے عالمی ریکارڈ پر لے آئیں۔

یہ ایک اچھی صورت ہے کہ چین جیسی اُبھرتی ہوئی قوت کی پائیدار دوستی پاکستان کو حاصل ہے۔ ہمارا دار و مدار امریکہ پر نہیں۔ نیز امریکہ ایک ایسا کنسورشیم بنا رہا ہے جس میں مغربی ممالک اور مسلم ممالک شریک ہوں اور اسلحہ اگر مغرب فراہم کرے تو اُس کی قیمت کا بوجھ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک اُٹھائیں۔

پاکستان تو افغانستان سے بالکل ملحق ہے۔ امریکہ نے تین اطراف میں روسی مزاحمت کے انتظامات کا منصوبہ بنایا ہے۔ ایک طرف چین، دوسری طرف ترکیہ اور تیسری طرف سعودی عرب (مع خلیجی ممالک) اور مصر۔

یہ بھی اچھی علامت ہے کہ امریکہ کی رائے عام افغانستان میں روسی جارحیت کے واقعے سے شدید متاثر ہوئی ہے۔ جیسے کوئی سوتا ہوا شخص ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ اس صورت میں صدر کارٹر یا کانگریس

کے لیے مناسب اقدامات کرنا آسان ہو گا۔

آخری بات مجھے صرف یہ کہنی ہے کہ حالات کا یہ طوفانی مدوجزر جس کی لہریں ہمارے گھر کی دہلیز سے ٹکرا رہی ہیں، ہرگز ایسا نہیں ہے کہ ہم پریشان ہو جائیں۔ اسلام سے رشتہ استوار رکھ کر اگر حوصلے بلند رکھے جائیں تو یہ مرحلہ بھی بخیریت گذر جائے گا۔

اس سلسلے میں چند امور ذہن نشین کرنا ضروری ہیں:۔

ایک یہ کہ اس وقت مصیبت تنہا ہمارے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اگر ہمارا وجود حائل نہ رہے تو مغربی ممالک کے ہاتھوں سے نہ صرف تیل کے مراکز جاتے ہیں بلکہ ایشیا، افریقہ، عرب اور ایران کی تجارتی منڈیاں بھی جاتی ہیں، جہاں سے سستی خام اجناس خرید کر مغرب والے اپنا مہنگا صنعتی مال بیچتے ہیں اتنا ہی نہیں حالیہ جارحیت کو اگر دنیا پسپا نہ کرا سکی تو امریکہ روس کے کسی بھی آئندہ اقدام پر کچھ نہ کر سکے گا بلکہ اُسے دم بخود ہو کر رہنا ہو گا، اور جہاں کہیں اس کا تھوڑا بہت عمل ہے وہاں سے بھی پسپا ہونا ہو گا۔ یہ بڑا فیصلہ کن موقع ہے۔ مصیبت ہماری اتنی نہیں، جتنی امریکہ اور مغرب والوں کی ہے۔

ہمارے وجود کے ساتھ اس وقت پورے عالم اسلام کا مستقبل بندھا ہوا ہے۔ مصر، سعودی عرب، ترکیہ، ایران، ملائشیا، انڈونیشیا سب خطرات کی زد میں ہیں۔ پس اس وقت ہم اپنا پارٹ ادا کرنے میں تو درحقیقت ہم پورے عالم اسلام کے تحفظ کا ذریعہ بنیں گے۔

پھر خود بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش اور ہند چینی کے ممالک بھی پہلے سے زیادہ مشکل صورتِ حالات سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اُن کی آزادانہ و خوددارانہ زندگیوں کا تحفظ بھی ہمارے ذریعے ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں ــــ پاکستان، ایران، ترکیہ، مصر اور دوسرے عرب ممالک میں ــــ اسلام ایک شعوری تحریک کے طور پر متحرک ہو چکا ہے۔ کسی جارحیت کے ذریعے اس مرحلے پر اس "اُبال" کو دبا دینے کے معنی یہ ہیں کہ کسی بوائلر میں جب بھاپ بھری ہوئی ہو تو آپ اُس کا ڈھکن بند کر دیں گے۔ بوائلر لازماً پھٹ کر ہر اُس قوت کو تباہ کرے گا جو بوائلر کو بند کر کے اس کے ڈھکن پر ڈیرا جمائے۔

تیسرے یہ کہ بلاشبہ جارحیت اور جنگی کارروائیاں تحریکوں کے نشوونما کو وقتی طور پر روک دیتی ہیں

لیکن جو تحریکیں وسیع لٹریچر رکھتی ہوں، وہ بار بار ابھر آتی ہیں۔ لٹریچر تاریخ کا حافظ ہے۔ یہ حافظہ اگر قائم رہے تو عشق فراموشی ممکن نہیں۔ خدا کا فضل ہے کہ پاکستان، مصر اور ترکیہ سے شائع ہونے والے اسلامی تحریکی لٹریچر کو بڑا پھیلاؤ ملا ہے۔ مختلف زبانوں میں امریکہ سے لے کر جاپان تک یہ موجود ہے۔ جنگی کارروائیاں جونہی رکیں گی۔ یہ لٹریچر اپنا کام کرے گا۔

چوتھے یہ کہ روس میں جو نظامِ جبریت قائم ہے اس کے آہنی خول سے جب وہ باہر نکلے گا تو اسے قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ پہلے سے انسانی حقوق کے لئے روس کے اندر تحریک موجود ہے، وہ آئندہ اور زور پکڑے گی۔ روس کے ترکستانی علاقوں کے مسلمان جب باہر کے مسلمانوں سے میل جول کریں گے اور دنیا کا لٹریچر اور اخبار پڑھیں گے اور ذرائع ابلاغ سے استفادہ کریں گے تو خود ان میں نئی رو پیدا ہوگی۔ روس کے حالیہ توسیعی اقدامات کا نتیجہ بالآخر یہی ہوگا کہ روس کا استحکام متزلزل ہو جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح چنگیز و ہلاکو کا طوفانِ بہیمیت اسلام سے ٹکرانے کے بعد سرد پڑ گیا۔

ان وجوہ سے میں سمجھتا ہوں کہ اگر پاکستان یا کسی اور مسلم ملک پر سے جارحیت کی لہر گذر جائے اور افراد کی ایک تعداد اس کا لقمہ بن جائے تو بھی اسلام کو بحیثیت ایک تحریک کے اب کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ ہمارے انقلاب کو چند سال کے لئے مؤخر تو کیا جا سکتا ہے، اب اسے ملیا میٹ نہیں کیا جا سکتا۔

باقی سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہی مالک الملک ہے۔ اس کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت نظامِ عالم چل رہا ہے، اس کی مشیت کسی کو اٹھاتی اور کسی کو گراتی ہے اور کسی کو بہت اونچا اٹھا کر جب گراتی ہے تو ریزہ ریزہ چکنا چور کر کے ہی چھوڑتی ہے۔

INDISPENSABLE BOOK FOR

JUDGES, ADVOCATES, ULAMA AND LAW STUDENTS

THE RECONSTRUCTION OF LEGAL THOUGHT IN ISLAM

Comparative study of the Islamic and the Anglo-American Systems of Law, and refutation of the Orientalists

(Revised and Enlarged Edition)

By

Dr. RIAZUL HASAN GILANI

FOREWORD

SYED ABUL A'LA MAUDOODI

Price : Rs. 50/-

IDARA TARJUMAN AL-QURAN

ICHHRA LAHORE